حضرت امجد کی شاعری

از

نصیر الدین ہاشمی

مولف دکن میں اردو، رہبر سفر یورپ، یورپ میں دکنی مخطوطات وغیرہ

۱۳۵۳ھ
۱۹۳۴ء

مطبوعہ شمس المطابع مشین پریس نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

نازک قم

قیمت ایک روپیہ عہ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض حال



میں شاعر ہوں اور نہ نقادِ سخن اس لئے حضرت امجد مدظلہٗ کی شاعری پر صحیح طور پر تبصرہ کرنا اور کلام امجد کے اصلی محاسن کو ظاہر کرنا میرے حدِ علم سے باہر ہے۔ البتہ اپنے حدِ ذوق کے موافق آپ کے مختصر کلام کو ایک خاص ترتیب اور مختصر صراحت کے ساتھ مرتب کر دیا ہے۔

یوں تو حضرت امجد کا ہر صنف کا کلام مختلف ناموں سے شائع ہو چکا ہے مگر آپ کا ہر قسم کا کلام اس طرح ایک جا نہیں ہے جس کے مطالعہ سے حضرت امجد کی شاعری کے مختلف پہلو اور آپ کے کلام کے خصوصیات بخوبی واضح ہو سکیں۔

میرا یہ مضمون دہلی کے رسالہ ساقی کے چار نمبروں میں شائع ہو چکا ہے اور اس کے بعد بعض دیگر رسالوں میں بھی نقل ہوا ہے چونکہ بعض احباب کی خواہش ہوئی کہ اسکو علیحدہ کتابی

صورت میں شائع کر دیا جائے لہذا کسی قدر اضافہ کے ساتھ یہ رسالہ پیش کیا جاتا ہے۔

میرے حسب استدعا میرے شفیق محترم واجب التعظیم علم دوست بزرگ عالیجناب نواب ڈاکٹر سر امین جنگ بہادر دام اللہ فیوضہ نے از راہِ عنایت و نوازش "پیش لفظ" لکھنے کی زحمت گوارا فرمائی ہے جو میرے اس رسالہ کے لئے باعث زینت ہے۔ فقط

نصیر الدین ہاشمی

پیش لفظ

ازعالیجناب نواب ڈاکٹر سرامین جنگ بہادر یم اے۔ پی ایچ ڈی کے سی یس آئی
صدرالمہام پیشی اعلیحضرت حضور نظام خلداللہ ملکہٗ وسلطنتہٗ



میرے نوجوان دوست نصیرالدین ہاشمی صاحب نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ان کی اس تالیف کا (پیش لفظ) لکھوں۔ میں نے ان کی محبتانہ خواہش کو پوری کرنا تین وجوہ سے مناسب سمجھا۔ ایک یہ کہ ہاشمی صاحب کے آباو اجداد میں اور میرے آباو اجداد میں دیرینہ علمی وعملی ارتباط و اتحاد رہا۔ دوسرے یہ کہ اُن کے اُستاد اور میرے کرم فرما مولوی سید احمد حسین صاحب امجد کی شاعری کا میں اسی قدر گرویدہ ہوں جس قدر کہ مصنف طال اللہ قدرہ کے دل میں اپنے اُستاد کے نازک مگر پُرمغز کلام کی قدر ومنزلت ہے۔ تیسرے یہ کہ جناب امجد دام فیوضہٗ کی شاعری اپنے ولی صفت استاد حضرت

محمد فاضل عرف غلام دستگیر ہمت طاب اللہ ثراہ کی شاعری
(نام تاریخی)
کو یاد دلاتی ہے کیونکہ میں نے دونوں میں ایک ہی فطرتی جولانی
نازک خیالی و صاف بیانی پائی جو حظِ روحانی و لطف خاص
کے باعث ہوتی ہے۔ البتہ ایک اہم فرق یہ ہے کہ میرے
اُستاد کے مذاق میں غضب کی کہولت جاگزیں ہوگئی تھی لیکن
ہاشمی صاحب کے اُستاد کا مذاق ہنوز جوان ہے اور ماشاءاللہ روزافزوں
ترقی پر ہے۔

نواب کرناٹک غلام غوث خاں اعظم کی وفات کے
بعد مدراس میں شعروسخن کی قدردانی کچھ ایسی گھٹی کہ حضرت
ہمت جیسے شاعر اس قدر دل شکستہ تھے کہ اپنے نام کے
ساتھ "مولوی" یا "پنڈت" (سنسکرت کے بھی ادیب
تھے) لکھا جانا عیب سمجھنے لگے تھے۔ لکھنے والے شاگردوں پر خفا
ہوتے تھے۔ اخیر عمر میں مجبوراً مدراس کے ایک کالج کے پروفیسر
ہوئے تھے لیکن نصاب کی کتب پڑھانے کے عوض انکے مضامین
سے متعلق فارسی اُردو و ہندی اشعار "دوہے" رباعیات یا قطعات
فی البدیہہ کہتے یا شب میں قصائد یا غزلیات لکھ لاتے اور اپنے

شاگردوں کو سُنا کر فوراً کاغذ چاک کر دیتے تھے کسی کو اُن کی نقل بھی لینے نہیں دیتے تھے۔ غرض میرے اُستاد جن کا خطاب (شہر اُستاد) تھا اُن کی افسردہ خاطری نے اُن کی شاعری کا نام و نشان تک نہ چھوڑا لیکن ہاشمی صاحب کے نصیب بڑے ہیں کہ ان کے اُستاد جن کا خطاب (حکیم الشعراء) واجبی ہے ان کی نازک مزاجی نے اپنی شاعری سے وہی ثابت کیا جو میرے اُستاد سمجھاتے تھے۔ یعنی شاعری ایک طائرِ طوبیٰ کی نغمہ سرائی کا نام ہے اور شعر وہی ہے کہ ہر انسان عالم و جاہل دونوں کے دل میں چٹکیاں لیتا رہے۔ اگر کسی شعر کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کیا جائے تو وہ ترجمہ پڑھنے والے کو ویسا ہی لطف دے جو خود شاعر کی اصل زبان پڑھنے والے کو مل سکتا ہے۔ چنانچہ عمر خیام کی رباعیات کا یہی حال انگریزی و فرانسیسی و جرمن ترجموں میں ہے جسکے باعث وہ یورپ میں کامل شاعر مانا جاتا ہے۔

شاعری بلکہ تمام فنونِ لطیفہ کا یہی کمال ہے۔ فقط

امین منزل سعید آباد دکن
۵ ر ذیحجہ ۱۳۵۲ھ

احمد حسین امین جنگ

حضرت امجد کی شاعری

چودہویں صدی ہجری کے شعرائے اردو میں حضرت امجد اپنے کلام کے لحاظ سے آسمان شاعری کے مہتاباں قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ یہ امر ہرگز مبالغہ نہیں ہے کہ موجودہ زمانہ میں آپ کی شاعری اپنی آپ ہی نظیر ہے، حال میں مجلسِ دارالمصنفین نے آپ کے حکیمانہ اور فلسفیانہ خصوصیات کے باعث حکیم الشعراء سے آپ کو ملقب کیا ہے۔ چنانچہ اس کی وجہ مولانا سید سلیمان صاحب ناظم دارالمصنفین کے الفاظ میں حسب ذیل ہے:۔

"معارف کا شیوہ نہیں کہ شاعروں کو خطابات بانٹے لیکن حضرت امجد کی نو بہ نو حکمت آموز شاعری نے اس کو اعترافِ فضل پر مجبور کیا اور لفظ حکیم الشعراء سے واقعہ کا اظہار کیا ہے۔" رسالہ معارف فروری ۱۹۳۳ء

حضرت امجد کے کلام کو چار اصناف میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔ نظمیں۔ تضمینیں۔ غزلیں رباعیاں مگر ان کی صراحت کرنے سے پہلے مختصر طور پر آپ کے حالاتِ زندگی پیش کئے جاتے ہیں۔

نام ونسب وغیرہ حضرت امجد کا نام سید احمد حسین اور تخلص امجد ہے۔ آپ حیدرآباد کے ایک صوفی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ آپ کے والد حضرت صوفی سید رحیم علی صاحب تھے۔ اور آپ کی والدہ کا نام صوفیہ تھا۔

پیدائش کا صحیح سنہ معلوم نہیں۔ سنہ ۱۳۰۰ھ کے چار یا پانچ سال بعد آپ کی پیدائش

۷ رجب بروز دوشنبہ ہوئی۔ اس لحاظ سے آپ کی پیدائش ۱۳۰۳ھ قرار دے سکتے ہیں۔ آپ کی عمر صرف چالیس دن کی تھی کہ آپ کے والد ماجد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ یتیم کی پرورش کا پورا بار بیوہ ماں کے ذمہ عائد ہوا۔ انہیں کے زیر سایہ آپ جوان ہوئے جو ۱۳۲۶ھ کی رودِ موسیٰ کی قیامت خیز طغیانی میں نذرِ سیلاب ہوگئیں۔

تعلیم و تربیت

تین برس کی عمر سے آپ کو لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ کاغذ۔ تختے اور در و دیوار پر شوقِ مشق ہوا کرتی۔ آڑی سیدھی لکیریں کھینچ کر اس شوق کا ثبوت دیا کرتے۔ مگر اس کے بعد جب تعلیم کی ابتدا ہوئی تو شروع شروع میں آپ کو تعلیم سے زیادہ رغبت نہیں تھی، چونکہ حافظہ ذہین تھا جو کچھ پڑھتے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتا۔ ابتدائی مکتب کی تعلیم کے بعد آپ مدرسۂ نظامیہ میں شریک ہوئے لیکن وہاں بھی باقاعدہ تعلیم نہیں پائی۔ خانگی طور پر درس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ علامہ سید علی سوشتری سنادالملک مرحوم سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات منشی۔ منشی عالم اور منشی فاضل میں کامیاب ہوئے۔ ملازمت کے بعد بھی طالب العلمی کا سلسلہ جاری تھا۔ اُستاد فلسفہ مولانا سید نادرالدین مرحوم سے جو علّامہ عبدالحق خیرآبادی کے شاگرد رشید تھے فیض حاصل کیا۔

ملازمت

آپ کا کوئی سرپرست نہیں تھا، بیوہ ماں آپ کی پرورش کی کفیل تھیں اس لئے آپ کو جلد ملازمت کی فکر کرنی پڑی۔ اولاً بنگلور جاکر خانگی طور پر ایک پارسی ڈاکٹر کو فارسی تعلیم دینے لگے۔ اسکے بعد بنگلور کے سرکاری مدرسہ میں آپ کا تقرر ہوا۔ مگر کچھ عرصہ بعد اس کو ترک کر کے اپنے وطن حیدرآباد آگئے اور یہاں مدرسہ دارالعلوم میں مدرسی کی خدمت پر مامور رہے۔ چند سال کے بعد دفتر صدر محاسبی میں منتقل ہو گئے

اور اب تک اسی دفتر میں منتظمی کی خدمت انجام دیتے ہیں۔

شاعری آپ کو پندرہ سال کی عمر سے شاعری کا شوق ہے۔ شیخ ناسخ کے دیوان کے مطالعہ سے اس شوق کی ابتداء ہوئی ؎

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا
مگر یارب، نہ ہو، نامہرباں وہ مہرباں اپنا

آپ کا پہلا اُردو شعر ہے۔ اسی طرح فارسی کا پہلا شعر حسب ذیل ہے۔

بسانِ سایۂ نصف النہارم پیشِ پا اُفتد　　　اگر خورشیدِ محشر را نظر بر داغ ما اُفتد

چند ابتدائی اُردو غزلیں حبیب کنتوری کو دکھائیں اور کچھ فارسی کلام غلامی ترکی کو بتایا مگر اس کے بعد کسی سے اصلاح لینے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اس طرح آپ فطرتی شاعر ہیں۔ آپ کا ابتدائی کلام غزل اور رباعیات طغیانی رودِ موسیٰ میں دریا بُرد ہو گیا، جو کلام آپ کا اب تک شائع ہوا ہے وہ ۱۳۲۶ھ کے بعد کا ہے۔

تصانیف سب سے پہلے آپ کی ایک سو رباعیات شائع ہوئیں مگر اب یہ نایاب ہیں۔ اس کے بعد اب تک جو تصانیف نظم و نثر شائع ہوئیں وہ حسب ذیل ہیں۔

"ریاضِ امجد" حصہ اول و دوم۔ ان میں آپ کی نظمیں اور تضمینیں اور کچھ قطعات ہیں "خرقۂ امجد" اس میں تیس ۳۰ نظمیں نعت اور تصوف کی ہیں۔ "رباعیات امجد" حصہ اول اور دوم۔ "نذرِ امجد" اس میں تمام نثر نعتیہ کلام ہے۔ "جمال امجد" اور "حج امجد"۔ "میاں بی بی کی کہانی" یہ تینوں کتابیں نثر میں ہیں۔

"جمالِ امجد" خود نوشتہ حالاتِ زندگی ہیں۔ آپ کی یہ کتاب نہایت معرکہ کی

تصنیف ہے بلکہ شاہکار ہے۔ یہ درحقیقت حقیقت کا مخزن تصوف اور حال و قال کا مرقع ہے جو دیدۂ بصیرت کے لئے آئینہ حقیقت ہے،

"حج امجد" اگرچہ آپ کا سفرنامۂ حج ہے مگر عام سفرناموں سے اس کو کوئی نسبت نہیں۔ اس کا انداز ہی کچھ اور ہے۔

حال و قال اگرچہ آپ صوفی خاندان کے ایک فرد ہونے کے لحاظ سے صوفی ہیں مگر موجودہ زمانہ کے فقیروں سے آپ کو کوئی مناسبت نہیں۔

اگرچہ آپ مرشدِ کامل ہیں مگر آجکل کی طرح پیری مریدی نہیں کرتے۔ آپ اپنی محنت سے روزی کماتے اور غریبوں کی دستگیری فرماتے ہیں۔ متواضع، منکسر المزاج ہیں۔ سادگی اور صفائی آپ کے جوہر ہیں۔ آپ کا ہر ملنے والا یہ تصور کرتا ہے کہ مجھ سے زیادہ کسی پر آپ کی نظرِ عنایت نہیں۔ دنیا دار آپ کو اپنی طرح تصور کرتے ہیں مگر صاحب حال اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ ؎

"پایا مقام اُس کا مولیٰ تیری گلی میں"

آپ کی شاعری عام شعراء سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ جس طرح حضرت مرزا مظہر۔ خواجہ میر درد۔ شاہ سراج اورنگ آبادی، قاضی محمود بحری اور شاہ ندیم اللہ بیجاپوری وغیرہم کی شاعری عشق حقیقی کی چاشنی رکھتی تھی اسی طرح آپ کی شاعری ہے۔

آپ ایک صاحب باطن صوفی صافی اور حقیقت نگار فطری شاعر ہیں۔ اس تفصیل کے بعد اب آپ کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

نظمیں حضرت امجد کی نظمیں پیش کرنے سے پیشتر کمالِ شاعری کے متعلق اظہارِ خیال کی ضرورت ہے، عام طور سے عمدہ نظم کے لئے تین امور نہایت ضروری ہیں

سادگی۔ نازک خیالی۔ اور تاثیر۔ جب تک ان میں سے کوئی نہ ہو کلام بہترین نہیں ہوسکتا۔

سادگی سے مراد یہ ہے کہ عبارت پیچدار نہ ہو۔ اشعار صاف اور عام فہم ہوں۔ قوانین فطرت سے متجاوز نہ ہوں۔ نازک خیالی یہ ہے کہ شاعر اپنی نظم کو نئی نئی تشبیہوں اور تمثیلوں سے مرصع کرکے اپنے کلام کو دلچسپ و دل آویز بنا دے اور پھر اس میں مبالغہ و تصنع نہ ہو۔ نازک خیالی کے ساتھ سادگی ہو۔ تاثیر کی کئی قسمیں ہیں، کوئی شاعر درد و غم سے اثر پیدا کرتا ہے، کوئی ہنسی مذاق سے تفریح طبع کا سامان پیدا کرتا ہے، کوئی حسن و عشق کی تصویر کھینچتا ہے۔ کوئی پند و نصیحت کا دفتر کھولتا ہے، کوئی اخلاق کی خوبیاں بیان کرتا ہے، کوئی نیچرل دلفریبیوں سے اپنے کلام میں اثر پیدا کرتا ہے۔

حضرت امجد کے کلام سے سادگی اور صفائی بخوبی ظاہر ہوتی ہے، صفائی کے لحاظ سے آپ کے اشعار نظم نہیں نثر معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا کلام نہایت صاف اور عام فہم ہوتا ہے۔ ادق عربی اور فارسی کے لغات سے مملو نہیں ہوتا۔ صفائی اور سادگی کے لحاظ سے جہاں اپنا آپ نظیر ہے وہاں نازک خیالی اور لطیف تمثیلوں اور تشبیہوں سے چار چاند لگ جاتے ہیں۔ پھر یہ تشبیہیں اور استعارے قوانینِ فطرت سے متجاوز نہیں ہوتے، مبالغہ آمیزی نہیں ہوتی۔ سادگی کے ساتھ نازک خیالی سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے کلام میں نگینے جڑے ہوئے ہیں جن کی صفائی اور چمک آنکھوں کو خیرہ نہیں کر دیتی بلکہ جاذب نظری سے اپنی طرف متوجہ کرلیتی ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا تاثیر کی مختلف صورتیں ہیں حضرت امجد کا کلام کبھی تو درد و الم میں ڈوبا ہوا سوز و گداز کی تصویر ہوتا ہے تو کبھی پند و نصیحت کا آئینہ، میرے خیال میں

کسی شاعر کے کلام کی سب سے بڑی خوبی اثر ہی [illegible]ب تک وہ کلام سننے والوں کو مسحور نہ کردے اور اس سے دلوں پر اثر نہ ہو ہرگز وہ شاعر کامیاب شاعر نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اثر کے متعلق خود حضرت امجد نے ایک قطعہ ارشاد فرمایا ہے جو گویا حقیقتِ نفس الامر ہے

کلام ایسا [illegible] سنا ہوگا تم نے   سنا آج اور کل اثر دل میں اترا
کہو شعر ایسا جو ہو [illegible]یز خنجر   ادھر منہ سے نکلا ادھر دل میں اترا

اس تفصیل کے بعد اب ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں حضرت امجد کا کلام پیش کرتے ہیں۔ اولاً آپ کی نظمیں پیش کی جاتی ہیں۔ ان کو چند اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ واقعہ نگاری۔ وصف نگاری۔ اخلاقی نظمیں اور صوفیانہ نظمیں۔

واقعہ نگاری واقعہ نگاری میں اس کلام کو داخل کیا جائے گا جو کسی واقعہ کا اظہار کرتا ہو۔ حضرت امجد کی نظمیں "قیامتِ صغریٰ" "قتیلِ جفا" "ایک بیکس کا خواب" وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔

۱۳۲۶ھ میں حیدرآباد میں رود موسیٰ کو جو قیامت خیز طغیانی ہوئی تھی وہ ایک مشہور واقعہ ہے۔ کئی دن کی مسلسل بارش سے صدہا تالاب ٹوٹ گئے اور رود موسیٰ میں شدت کے ساتھ پانی آگیا۔ اس طغیانی سے بیسیوں محلے اجڑ گئے، صدہا مکان برباد ہو گئے۔ ہزاروں آدمی نذرِ اجل اور ہزاروں بے خانماں ہو گئے۔ چونکہ حضرت امجد کا مکان بھی ندی کے قریب تھا اس لئے پانی کی زد میں آکر اس کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ رات کے وقت پانی کی آمد شروع ہوئی۔ آٹھ بجے تک گھٹنوں گھٹنوں پانی آگیا، آپ مع اہل و عیال اپنے گھر سے نکل کر ایک دوسرے پاس کے مکان میں جو نہایت مستحکم اور مرتفع تھا

چلے گئے مگر تھوڑی دیر کے بعد اُس مکان میں بھی پانی آگیا، اُس کے در و دیوار گرنے لگے آخر صبح صبح آپ مع بی بی دختر اور والدہ چاروں کے چاروں پانی میں بہنے لگے، تینوں کو تو موجوں نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا صرف ذات اقدس اس طوفانِ بلا سے بچ گئی۔

اس واقعہ کے متعلق آپ کی نظم "قیامتِ صغریٰ" سے موسوم ہے۔ اس کا ہر شعر سوز و گداز سے درد و الم کا دریا ہے، حرف نہیں نشتر ہیں، ناوک ہیں جو دل کو چھلنی کئے بغیر نہیں رہتے، وہ کونسا دل ہے جو اس نظم کے پڑھنے کے بعد چاک نہیں ہوجاتا وہ کونسی آنکھ ہے جو اشکبار نہیں ہوجاتی، تاریکی کی حالت، بارش کی کیفیت، مخلوق کی بے چینی، مکانوں کا گرنا، لوگوں کا چیخنا، پانی کا گھٹنوں تک آنا، گھٹنوں سے کمر، کمر سے سینہ، سینہ سے حلق تک پہنچنا، پانی میں شب بھر رہنا، صبح صبح تارے کی طرح ڈوب جانا، اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو اپنی آنکھوں کے سامنے ڈوبتے دیکھنا اور امداد نہ کرسکنا حسرت کے ساتھ دیکھتے رہ جانا، ان تمام واقعات کے اظہار سے عینی تصویر سامنے آجاتی ہے، کچھ نمونہ ملاحظہ ہو۔

ابتداء۔

میں موردِ حرمان و گرفتارِ بلا ہوں — ماں باپ سے بچھڑا ہوا بچوں سے جدا ہوں
گہ محوِ فغاں ہوں کبھی مصروفِ بکا ہوں — معلوم نہیں خود مجھے میں کون ہوں، کیا ہوں
بیہوش کبھی ہوں کبھی ہوجاتا ہی سکتا — وہ عالمِ حیرت ہی کہ کچھ کہہ نہیں سکتا
وہ رات کا سناٹا وہ گھنگور گھٹائیں — بارش کی لگاتار جھڑی سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں — وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں
پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی — پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی

دم لینے کی طاقت تھی نہ ستانے کی تاب آہ — تھی زندگی خرد و کلاں نقش برآب آہ
کرتی تھی الگ سیلِ رواں خانہ خراب آہ — طوطے کی طرح آنکھیں بدلتے تھے حباب آہ
جان لینے کو ہر اک تنفس کمربستہ تھیں — بے وجہ نہیں تیوریاں موجوں کی چڑھی تھیں
تاریکی میں دریا نے اک اندھیر مچایا — سیلابِ فنا بن کے کیا سب کا صفایا
پاؤں سے گزرتا ہوا پھر سینہ تک آیا — آگے جو بڑھا موت نے بس حلق دبایا
شب بھر رہے سب پانی میں فوارے کے مانند — ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کے مانند
مادر کہیں، اور بہن کہیں با دیدۂ پُرنم — بی بی کہیں، اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم
عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم — کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیّرِ اعظم[لہ]
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئے پیارے — وہ غم تھا کہ دن کو نظر آنے لگے تارے
بیٹی! نہ تجھے باپ نے افسوس بچایا — دستِ ستمِ سیلِ فنا سے نہ چھڑایا
دریا نے ترے حال پہ کچھ رحم نہ کھایا — کیا بھولی سی صورت پہ اُسے رحم نہ آیا
یہ جسم ترا پھول سا دیواروں سے ٹکرائے — سیلاب میں بہ جائے تری ننھی سی جان ہائے

یہ طویل نظم ہے، آخری بند حسب ذیل ہے:-

لِلّٰہ یہ بگڑی ہوئی تقدیر بنا لو — میں خاک پہ گرنے کو ہوں تو جلد سنبھالو
امجد کو بھی اعظم کی طرح پاس بلا لو — اک بار ذرا پھر مجھے چھاتی سے لگا لو
دل میں مرے اب صبر کی طاقت نہیں ہائے — دُنیا میں بغیر آپ کے راحت نہیں اماں

لہ اعظم النساء دختر۔

پندرہ بیس سال قبل کلکتہ میں ایک افسوس ناک حادثہ ہوا تھا۔ عام طور سے بنگال میں رواج تھا کہ شادی کے وقت دلہن والوں کی جانب سے ایک بڑی رقم دولہا کو دی جاتی۔ دولہا والے بڑی بڑی رقموں کا مطالبہ کرتے تھے۔ دولہن کے غریب والدین کو اس سے پریشانی ہوتی تھی۔ ایک غریب مگر تعلیم یافتہ خاتون اسنوہیلتا تھی، اُس کو اپنے والدین کی فکر اور پریشانی نے اس امر پر مجبور کر دیا کہ اپنی جان دے کر اُن کو پریشانی سے آزاد کر دے۔ ایک دن اُس نے اپنے آپ کو جلا کر خاتمہ کر لیا۔ اس افسوسناک واقعہ کے بعد تمام بنگالیوں نے رقمی مطالبہ سے توبہ کر لی۔

حضرت امجد نے اس واقعہ کو "قتیلِ جفا اسنوہیلتا" کے نام سے نظم کیا ہے۔ ذات امجد واقعہ کی چشم دید نہیں تھی اخبارات سے معلوم شدہ حالات کی بنا پر نظم لکھی گئی مگر اس کے باوجود اس خوبی سے اس کو نظم کیا ہے کہ شاعر کا چشم دید واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو :-

ایک لڑکی تھی کہیں سنہیلتا — جسکا سِن تھا تیرہ چودہ سال کا
دلربا انداز مکھڑا چاند سا — دیکھتا جو کوئی کہتا برملا
سحر دارد نرگس جادوئے تو — گرد سنبل بر پریشاں موئے تو
دیکھکر اسکا شباب اور سن و سال — باپ کو آتا تھا شادی کا خیال
تھا مگر افلاس سے آشفتہ حال — سخت تھا لڑکے والوں کا سوال
مانگتے تھے وہ کم از کم دو ہزار — کسطرح بیکس اُٹھا سکتا یہ بار
چاہتا تھا بیچ دے رہنے کا گھر — جھونپڑے میں زندگی کرلے بسر
بار جو کچھ ہو اٹھالے اپنے سر — دستگیرِ بیکساں ہے پرمیشر

زندگی جیسے بنے کٹ جائے گی ورنہ عزت چار میں گھٹ جائیگی
ملکے اک دن شوہر و زن سات سات کرتے تھے سنہیلتا کی شادی کی بات
کہتے تھے افلاس میں ہیں مشکلات آبرو انسان کی ہے دولت کے ہات
زر تواند ذرّہ را اختر کند زر تواند قطرہ را گوہر کند
پاس پردہ کے تھی سنہیلتا کھڑی بات ان کی کان میں اس کے پڑی
آگئی سناٹے میں اک دو گھڑی لیک تھی چھٹپن میں فہمیدہ بڑی
سوچ کر کچھ آگئی اپنی جگہ آہ وہ غش کھا گئی اپنی جگہ
اُٹھ کے پھر بستر سے وہ کہنے لگی آہ تُف ہے زندگانی پر مری
میری خاطر باپ پر بپتا پڑی ہائے میں کمبخت کیوں پیدا ہوئی
خوب ہوتے گر نہ زادے مادرم جائے شیرم زہر دادے مادرم
باپ پر ٹوٹے ستم میرے لئے وہ اُٹھائے رنج و غم میرے لئے
بیس سو ہوں کم سے کم میرے لئے بیچ کر گھر دے رقم میرے لئے
اِسلئے کہہ دے کوئی از راہِ کرم اب وہ بیٹی کا کریں کریا کرم

....

سر پہ روغن ڈالکر جلنے لگی شمع تھی کافور کی گلنے لگی
زندگی کی دوپہر ڈھلنے لگی ہاتھ غم سے موت بھی ملنے لگی
ہوگئی جل بھن کے ٹھنڈی شعلہ فام چاند سی صورت ہوئی آخر تمام

اس کے بعد مزید بند ہیں جس میں رسمِ بد کی خرابی، ماں باپ کے غم والم پر اظہار خیال ہوا ہے۔

"ایک بیکس کا خواب" میں اپنے خواب کے واقعات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ماں کو حالتِ خواب میں دیکھنا اور ان سے گفتگو وغیرہ کو نہایت شرح وبسط سے بیان کیا ہے۔

وصف نگاری وصف نگاری اور مناظرِ قدرت پر اظہارِ خیال کو ایک ہی تصور کیا جاتا ہے حالانکہ دونوں میں فرق ہے۔ مناظرِ قدرت سے انسانی جذبات متاثر ہوتے ہیں اس لئے اس میں جذبہ انگیز چیزیں داخل ہوگئیں مثلاً چاندنی رات، بارش، موسمِ بہار کی کیفیت۔ آبشار، پہاڑ، جنگل وغیرہ اور وصف نگاری میں ان کو داخل کیا جائیگا۔ جن کے لئے جذبات کی تحریک کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ قدرت کے موجودات کی حقیقت اور حالت یا ان کے نمایاں اوصاف بیان کئے جائیں۔

حضرت امجد کی نظمیں اس موضوع پر بھی ہیں جن کے مطالعہ سے بخوبی معلوم ہوسکتا ہے کہ کس طرح آپ نے وصف نگاری کا حق ادا کیا ہے۔ میری قمری، ماں اور بچی، یتیم کی دعا وغیرہ اسی قسم کی نظمیں ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

میری قمری

ہم نے قمری عجیب پالی ہے ۔۔۔ مظہرِ نغمۂ بلالی ہے
کیا ہی نازوں سے اسکو پالا ہے ۔۔۔ قفسِ نقرئی میں ڈالا ہے
قمریاں یوں تو دیکھی بھالی ہیں ۔۔۔ اسکی باتیں مگر نرالی ہیں
گیت توحید کا سُناتی ہے ۔۔۔ راہِ حق کی طرف بلاتی ہے

پیاری پیاری وہ نور کی گردن — جس پہ قربان حور کی گردن
لال لال اسکی نرگسِ گلفام — یا بھرا ہے شرابِ سُرخ کا جام
اسپہ طرّہ ہے سرخیٔ منقار — گل سمجھ کر نہ کرے بلبل پیار
رنگِ منقار ارغواں یکسر — یاد دھڑی پان کی ہے ہونٹوں پر
یا کوئی ناخن حنائی ہے — ہائے کیا سُرخ چونچ پائی ہے
پاؤں بھی سُرخ رنگ بستہ ہے — دل حنا کا اسی سے پستا ہے
زیب و زینت سے اسکی آن بن ہے — سادگی میں ہزار جوبن ہے

طویل نظم ہے۔ ماں اور بچی والی نظم میں بچی کی زبان سے گلاب کے پھول پر اظہارِ خیال ہوا ہے، دعائے یتیم میں یتیم کی دعا کا ذکر ہے۔ یہ نظم سوز و گداز کے لحاظ سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، یوں تو امجد کا پورا کلام سوز و گداز سے مملو ہے مگر اس نظم میں اس کی انتہا ہو گئی ہے، بطور نمونہ کچھ حصہ ملاحظہ ہو:—

یتیم لڑکی کی دعا

مقصد مراد لا دے او آسمان والے — قسمت مری جگا دے او آسمان والے
گم گشتہ کا پتا دے او آسمان والے — راہِ عدم بتا دے او آسمان والے
ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے

ہر لحظہ چشم تر ہوں دن رات نوحہ گر ہوں — اتنی خبر نہیں ہے میں کون ہوں کدھر ہوں
ماتم میں وارثوں کے دنیا سے بیخبر ہوں — اس کمسنی میں ہی ہے بے مادر و پدر ہوں
ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے

ظالم اجل نے بالکل تاراج کر دیا گھر
سب چل بسے عدم کو اب باپ ہے نہ مادر
اب پیار کرنے والا کوئی نہیں ہے دم بھر
آنکھیں لگی ہیں میری مالک ترے کرم پر

ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے

او آسمان ستمگر مجھپر نہ یوں ستم کر
کم عمر خستہ جاں پر اب جور و ظلم کم کر
او باغبانِ قدرت شاخِ الم قلم کر
بے وارثوں کے وارث بیکس پہ بھی کرم کر

ما نباپ سے ملا دے او آسمان والے

....

ماتم میں ہمدموں کے دم اپنا توڑتی ہوں
دنیا نے مجھکو چھوڑا میں اُسکو چھوڑتی ہوں
باب کرم پہ تیرے سر اپنا پھوڑتی ہوں
منت سے تیرے آگے اب ہاتھ جوڑتی ہوں

ماں باپ سے ملا دے او آسمان والے

اخلاقی نظمیں

ہماری قدیم شاعری میں اخلاقی شاعری کا بھی عنصر ہوتا تھا اخلاقی عنوانات زہد و توکل، قناعت وغیرہ پر متفرق اشعار اور قطعات ملتے ہیں مگر جدید شاعری میں اخلاق کے مختلف شعبوں مثلاً صبر و محبت، اتفاق، اتحاد، ہمت و استقلال وغیرہ عنوانات پر کثرت سے نظمیں لکھی گئی ہیں۔

حضرت امجد کا یہ موضوعِ خاص ہے، اسپر بے شمار رباعیاں لکھی گئی ہیں۔ ان سے قطع نظر (کیونکہ ان کی صراحت آگے آئے گی) امجد کی مختلف نظمیں بھی اس عنوان کے تحت آسکتی ہیں جن میں سے بعض کے عنوان حسب ذیل ہیں:۔

حاجت بسیار نیست، خموشی معنی دارد، من قنع شبع، وغیرہم

نمونہ ملاحظہ ہو:۔

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

کہتے ہیں کسی بادشہ عادل کو
خالق نے عطا کیا تھا اک شہزادہ
ہشیار سمجھدار ذکی دعاقل
جسکا ثانی کسی نے دیکھا نہ سُنا
اللہ آمین سے جب سنبھالا کچھ ہوش
اسنے یک لخت بولنا چھوڑ دیا
لب پہ کچھ ایسی لگ گئی مہر سکوت
بیچارے کو گویا ہوگیا تھا سکتا
ہر چند بہت ہی کوششیں کیں سب نے
لیکن اسکو نہ بولنا تھا اصلا

ناگاہ کسی شاخ پہ بولا طائر
لیکر بندوق اک شکاری دوڑا
آواز کی سمت بس چلادی بندوق
آواز کے ساتھ ہی وہ ڈالی سے گرا
دی جان پھڑک پھڑک کی جب طائر نے
اسوقت یہ شہزادے نے فرمایا
دیکھا انجام بولنے کا تم نے
کمبخت نہ بولتا نہ مارا جاتا

دیگر

کبھی میراث پر نظر نہ کرو
علم تم کو کرے گا دولت مند
دولت علم کو زوال نہیں
مال و دولت کو ہیں ہزار گزند
باپ کے مال پر نہ اتراؤ
خود بنو ہوشیار دانشمند
ہاں زمانہ کا اعتبار نہیں
نہیں دولت کسی جگہ پابند
بے مروت ہے طائر اقبال
بے وفا ہے زر و گہر کا سمند

صوفیانہ نظمیں:۔ اخلاقی مباحث کی طرح تصوف بھی حضرت آمجد کا خاص حصہ ہے۔ جس طرح قدیم شعراء کے دیوان اس موضوع سے بھرے ہیں اسی طرح موجودہ عصر کے شعراء کا کلام بھی اس عنوان پر دفتر بے پایاں رکھتا ہے۔

حسن و عشق شاعری کا عام موضوع ہے مگر اس عنوان کی اردو شعراء نے جو مٹی پلید کی ہے وہ ایک حقیقت نفس الامر ہے۔ عشقیہ کلام سے شعراء کے دیوان پڑے ہیں مگر حقیقت سے دور اور اصلیت سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتے، ان کا معشوق یا تو فرضی ہوتا ہے یا بازاری اور اس کی تعریف میں جو موشگافی ہوتی ہے وہ اظہر من الشمس ہے معشوق بے وفائی، بے مروتی، جور و جفا، ظلم و ستم کے اوصاف سے متصف ہوتا ہے اور پھر اس کے حسن و انداز غمزہ و کرشمہ کی جو تعریف جس مبالغہ آمیزی اور رنگ آمیزی سے کی جاتی ہے وہ بھی معلوم ہے۔ اس بے سر و پا مبالغہ آمیزی کے باعث ایک گروہ اس کا مدعی ہو گیا ہے۔ کہ اردو شاعری میں سوائے جھوٹ اور مبالغہ آمیزی کے کچھ ہے ہی نہیں۔ عشق حقیقی سے ہمارے اکثر شعراء نا آشنا ہوتے ہیں اور پھر پردہ کے باعث ان کو کوئی معشوق نظر بھی نہیں آتا جس کی مدح سرائی میں رطب اللسان ہوتے شاہدان بازاری ان ہی اوصاف کے حامل ہوتے ہیں جن کا اظہار ہمارے شعراء نے کیا ہے۔ کسی شاہد بازاری سے مہر و وفا کی امید کرنا مروت اور رحم کی توقع رکھنا جس طرح محال اور ناممکن ہے وہ ظاہر ہے لہذا شعراء کا ان کے ظلم و ستم کا نالہ کرنا ان کی ہرجائی اور جفاکشی پر رونا آنسو بہانا بجا تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ عشق حقیقی کو چھوڑ کر عشق غیر حقیقی کی طرف مائل کیوں ہوئے اور کیوں ہرجائی معشوق کا انتخاب کیا۔

عشق حقیقی پر اظہار خیال کرنا کوئی آسان امر نہیں ہے، ہمارے قدیم شعراء سے

حضرت مظہر۔ خواجہ درد قاضی محمود بحری۔ شاہ سراج اورنگ آبادی اور شاہ ندیم اللہ بیجاپوری وغیرہ کی شاعری بیشک عشقِ حقیقی کا مظہر ہے۔ موجودہ عہد کے شعراء میں سے بہت کم ایسے ہیں جن کے کلام میں عشقِ حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہو۔

حضرت امجد نہ صرف ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ خود بھی ایک بلند مرتبہ صوفی ہیں جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، آپ کا کلام قال نہیں بلکہ حال ہوتا ہے۔ آورد نہیں بلکہ آمد ہوتا ہے۔ حالتِ کیف میں جو کچھ گزرتا اور نظر آتا ہے وہی زبان او قلم سے نکلتا اور ادا ہوتا ہے۔

ہمارے قدیم شعراء نے عموماً غزلوں میں اس عنوان پر طبع آزمائی کی ہے مگر حضرت امجد کی مختلف نظمیں بھی اس عنوان کے تحت آتی ہیں "ریاض امجد" حصہ اول کے بعض عنوان حسب ذیل ہیں۔

صدائے درویش۔ دربارِ خواجہ۔ جوشِ رحمت۔ فریادِ مجنوں۔ دُنیا اور انسان تُو پی کے سو کون۔ عاشق کا جنازہ۔ مجلس سماع۔ پیٹ کا ظلم۔ کوئلہ بھئی نہ راکھ۔ "ریاض امجد" حصۂ دوم کے بعض عنوان یہ ہیں۔ دلا رطب دلا یابس۔ سبحان ربی الاعلیٰ۔ رحمتی وسعت کل شئی۔ حکایت و شکایت۔ ادعوا ربکم تضرعاً۔ ہو اضحک و ابکیٰ۔ اذا سالک عبادی عنی فانی قریب۔ میرا رام کہاں ہے۔ فی الموت حیوٰۃ۔ مکالمہ جان و تن قل متاع الدنیا قلیل وغیرہ "خرقۂ امجد" کی تیسوں نظمیں تمام تر صوفیانہ ہیں۔

ذیل میں آپ کے صوفیانہ کلام کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے:۔

کوئلہ بھئی نہ راکھ

سانہ کھلنے پائے اکدن دیدۂ عبرت نما میرے جوانی جا چکی اب رُو بہ پیری ہیں تویٰ میرے

نہ سمجھا آج تک میں کیوں بنا ہوں اے خدا میرے — جہاں کا ذرّہ ذرّہ کارآمد ہے سوا میرے
لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھئی راکھ — میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ
فنا ہے تیرگی شب سے ہو نورِ سحر پیدا — فروغِ صبح مٹ جائے تو ہوں انوارِ خور پیدا
بدل جائے اگر قطرہ کی حالت ہو گہر پیدا — ملے جب خاک میں دانہ تو ہو برگ و ثمر پیدا
لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھئی راکھ — میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ
غذا تحلیل ہو کر خون بن جاتی ہے پیکر میں — یہی خون جسم کے ہو جاتا ہی عنبر گاؤ عنبر میں
مخمّر ہو کے کام آتی ہے مٹی جام و ساغر میں — شجر سوکھے تو لکڑی بنکے جلجاتا ہے مجمر میں
لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھئی راکھ — میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ
محلِ صد تغیر ہے ہمیشہ عالمِ فانی — کبھی پانی ہوا ہو جاتا ہے گاہے ہوا پانی
بدلتی ہیں ہزاروں صورتیں طبعِ ہیولانی — مگر اپنی تباہی پر مجھے ہے سخت حیرانی
لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھئی راکھ — میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ
ہویدا ہی حباب و موج دریا کی روانی میں — سنا ہی بال گل کر سانپ ہو جاتا ہی پانی میں
ہمیشہ نت نئی حالت ہے دورِ آسمانی میں — بگڑ کر کچھ نہ کچھ بنتی ہی ہر شئے دہر فانی میں
لکڑی جل کوئلہ بھئی اور کوئلہ جل بھئی راکھ — میں پاپن ایسی جلی نہ کوئلہ بھئی نہ راکھ

اس نظم سے آپ کے فلسفیانہ انداز کا بھی بخوبی علم ہو سکتا ہے۔ عالم کی متغیر حالت کا جو صحیح نقشہ زمانۂ موجودہ کے سائنس کے موافق کھینچا ہے وہ قابلِ غور ہے۔

جوشِ رحمت والی نظم میں بتایا گیا ہی کہ ایک خدا ترس نیک شخص شب و روز مصروفِ عبادت رہا کرتا تھا۔ اس کو صدائے غیب آئی کہ تیری عبادت مقبول نہیں مگر دُھن کے پکّے نے اپنا کام نہ چھوڑا۔ ایک مرید نے کہا ہوش میں آؤ جہاں دینے والا ہی نہیں

پھر مانگنے سے کیا فائدہ۔ اس نے جواب دیا تیری نصیحت صحیح مگر میں اس کریم سے بڑھ کر کس کو پاؤں گا کہ اس کے دروازہ پر چلاؤں اور صدا دوں۔

کہا اتنا اور پھر بسوز و گداز — پکارا کہ اے خالقِ کارساز
نظر ہے مری تیری رحمت پہ بس — سوا تیرے ہے کون فریادرس
تجھے کہتے ہیں سب غفور الرحیم — تو ہے رحم فرمائے حالِ سقیم
چو عاجز رہانندہ دانم ترا — دریں بیکسی چوں نخواہم ترا
جگر غم سے جب تھام لیتا ہوں میں — تڑپ کر ترا نام لیتا ہوں میں
تسلی ہے میری ترے نام سے — نہ محروم کر رحمتِ عام سے
نہ دیکھوں گا حرماں کی شکلِ مہیب — نہ جاؤنگا اس در سے میں بے نصیب
یہ مانا کہ بے حد گنہ گار ہوں — سزا تو جو دے میں سزاوار ہوں
مگر کر نہ دور اپنی درگاہ سے — نہ منہ پھیر اس معذرت خواہ سے
ترا بندہ از من بہ انند بسے — مراچوں تو دیگر نیفتد کسے

پھر تو رحمتِ خدا جوش میں آتی ہے اور صدائے غیب آتی ہے کہ:—

بلاتی ہے آ تجھ کو رحمت مری — نہ جائے گی خالی عبادت تری
قبول ست گرچہ ہنر نیستش — کہ جز ما پناہے دگر نیستش

فلسفۂ موت وحیات کی تشریح کو کس قدر صاف اور عام فہم طریقہ سے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے ملاحظہ ہو:—

عالمِ ظاہر سے جب پھیری نگاہ — سامنے تھا بادشاہِ کجکلاہ

بجھ گئی جب مشعلِ نورِ نظر — سامنے آنکھوں کے تھا رشکِ قمر
جب سماعت سمع سے قاصر ہوئی — اسکی آوازِ خفی ظاہر ہوئی
جب شمیمِ شامہ رخصت ہوئی — بوئے وصلِ دوست سے راحت ہوئی
اسکو پایا آپ جب میں کھو گیا — بات کی اس نے، میں جب چپ ہو گیا
پائی قدموں میں جگہ جب سر دیا — اس اجل نے مجھکو اعلیٰ کر دیا
بلبلِ بیتاب گل سے مل گیا — اللہ اللہ جزو کُل سے مل گیا

انسان کی ہستی ایک مختصر عالم ہے جس میں بیسیوں نہیں بلکہ صدہا کل پرزے کارفرما ہیں اس کی تفصیل اور بہر شاہدِ مقصود کا پتہ کس بہترین طریقہ سے چلایا گیا ہے. اسکو "میرا مکان" میں ملاحظہ فرمائیں۔

تن کا حصار کھینچ دل کا مکان بنایا — دروازہ عقل کا اک اسمیں عجب لگایا
ڈالا خیال کا اک اس پر لطیف پردہ — حس کو بنا کے درباں دروازہ پر بٹھایا
خونِ جگر سے میرے رنگیں محل بنا کر — نورِ نظر کا اس میں روشن دیا جلایا
جب اسطرح سے بنکر تیار ہو گیا گھر — پھر روح بنکے اسمیں خود آپ ہی سمایا
چھپکر کہیں وہ ہمسے باہر نہیں گیا ہے — وہ بحرِ حسن و خوبی کوزے میں ہے سمایا
وہ بادشاہِ عالم شہ رگ سے بھی قریں ہے — قرآں میں خود اُسنے اپنا پتہ بتایا
شکلِ حصار بالکل سایہ مکان کا ہے — اس عکس ہی سے ہمنے شخصی نشان پایا
اُسکا وجود ہم میں موجود اگر نہیں ہے — سب نے ہماری آگے کیوں اپنا سر جھکایا
اغیار نے جستجو میں دنیا کی خاک چھانی — اپنے مکان ہی میں اُس کا نشان پایا

یہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ بہترین شاعری کے تین لوازم ہیں۔ سادگی، صفائی، نازک خیالی اور تاثیر یہ تینوں امور ایک جگہ بہت کم جمع ہوتے ہیں۔ مگر حضرت امجد کے کلام میں یہ تینوں امور ایک جگہ جمع ہیں۔ ایسی نظمیں بھی متعدد ہیں، ایک نظم کا کچھ حصہ ملاحظہ ہو:۔

عمر اک دن ہو کہ سو سال گزر جاتی ہے　　دوش پر کملی ہو یا شال گزر جاتی ہے
گر امیروں کی بہ اقبال گزر جاتی ہے　　بیکسوں کی بھی بہر حال گزر جاتی ہے
از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

حاکمیں کاخ نشیں خاک نشیں یکساں ہے　　بند کی آنکھ تو بہر زشت و حسیں یکساں ہے
پیٹ میں لقمۂ تر نانِ جویں یکساں ہے　　آگئی نیند تو بہر فرش و زمیں یکساں ہے
از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

جی نہیں چاہتا افسوس مگر مرنا ہے　　گر نہیں خوفِ خدا موت سے تو ڈرنا ہے
مٹی پتھر سے غرض تعمیر شکم بھرنا ہے　　جھونپڑی ہو کہ محل ہم کو بسر کرنا ہے
از ہوسہا بگزر یا مگزر میگزرد

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ "خرقۂ امجد" کی تمیسوں نظمیں صوفیانہ ہیں ہر ایک ایک جداگانہ عنوان پر لکھی گئی ہے اکثر عنوان قرآن شریف کی کسی آیت کو قرار دیا گیا ہے۔

بعض عنوان یہ ہیں:۔

الایمان بین الخوف والرجا، اقیموا الصلوٰۃ، ما عبدناک حق عبادتک، منازل نزول، لاکلفنا علی انفسنا اکرمکم عنداللہ اتقاکم، ان اللہ لطیف بالعباد، تبہ،

ترقی در تنزل وغیرہ۔

تصوف کا ایک اہم مسئلہ تنزیہ ہے، بڑے بڑے صوفیا اس کے حل میں سرگرداں رہے ہیں۔ صاف اور واضح طور سے بہت کم اس مسئلہ کو سمجھایا گیا ہے۔حضرت امجد نے کس قدر صاف اور عام فہم الفاظ میں اسکی توضیح کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ پھر موجودہ سائنس کے مسائل کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔حالانکہ حضرت امجد انگریزی سے ناواقف ہیں۔

تنزیہ کی بارگاہ سے آیا ہوں
میں دور دراز راہ سے آیا ہوں

پردہ میں جلال کے رہا ہوں برسوں
عالم میں خیال کے رہا ہوں برسوں

بے صورتی اصل میں ہے صورت میری
انتھر میں ہے جلوہ گر لطافت میری

ہے میرا ہی حکم علتِ حسنِ قبول
یہ مادیت ہے میری طاقت کا نزول

جلباب غیاب میں رہا ہوں برسوں
الوانِ سحاب میں رہا ہوں برسوں

میں مہر کبھی ہوا، کبھی ماہ ہوا
ہر راہ میں راہ رو کے ہمراہ ہوا

ہے میرا ہی نور جلوہ گر آسماں میں
میں ہی ہوں نہاں حقائق اشیاء میں

ہیں نا متناہی انتقالات مرے
ہیں فہم سے دور استحالات مرے

سر تا بقدم عقدۂ لاینحل ہوں
میں مطلق کا تعین اول ہوں

کھینچا ہے نزول میں محبت نے مجھے
ڈالا ازحمت میں میری رحمت نے مجھے

ظاہر ہی کمالِ حسن سے عشق کا رنگ
پیدا ہوا خالِ حسن سے عشق کا رنگ

وحدت کے سوا دوئی کا یاں نام نہیں
ہے صبح میری تو غیر کی شام نہیں

تزکیۂ نفس ہی تصوف میں نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ سب سے پہلے یہی زینہ طے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے بعد کہیں سلوک کی منزل حاصل ہوتی ہے۔ جب تک تزکیۂ نفس سے انسان اپنے جسم کو اور اپنے قلوب کو مصفّا نہ کرلے اُس وقت تک سلوک کا راستہ طے نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے صوفیائے کرام اپنی ریاضت میں تزکیۂ نفس کو ہی مقدم قرار دیتے ہیں۔ نفس کو خواہشات مادّی سے پاک کرنے کا نام تزکیۂ نفس ہے۔ اسکا بیان اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا کہ اس پر عمل کرنا۔ حضرت امجدؔ نے جو کچھ اس پر لکھا ہے وہ اپنے عمل کے بعد لکھا ہے اور ظاہر ہے جو امور عمل کے بعد لکھے گئے ہونگے وہ کس طرح با اثر اور مجرب ہوں گے۔ اس حیثیت سے حضرت امجدؔ کی نظم تزکیۂ نفس خاص اہمیت رکھتی ہے۔

آئینہ پہ سانس سے نہ آجائے غبار | پہنچے نہ ہوائے نفس ہُو تک ہشیار
آنچ آئے نہ اُس کی آبرو پر ہشیار | نشتر نہ لگے رگِ گلو پر ہشیار
ہاں روک لے اس کشتی طوفانی کو | چلنے ہی نہ دے ہوائے نفسانی کو
ہے نفس ہی تیرا تیرا دشمن ہشیار | اے طالبِ زیست نفس امّارہ کو مار
ہی لطف کہ آپ آپ سے کھو جائے | نفسِ امّارہ مطمئن ہو جائے
دم کے ہمراہ صدائے دم ساز آئے | ہر سانس میں ارجعی کی آواز آئے
شیطان کی پیروی نہ کر اے انسان | مومن ہے اگر تو مان رب کا فرمان
گندی خواہش کو چھوڑ دے اے بندے | بت مادیت کا توڑ دے اے بندے
اس مہر کی آنکھوں میں نہاں قہر ہی ہے | اس نوش کے ساتھ نیش کا زہر ہی ہے
حق کو آلودہ کر دیا ناحق سے | اے طالبِ حق ہاتھ اٹھا ناحق سے

ہاں دیر نہ کر لگادے اک وار کہیں | ہو جائے حلال نفس مُردار کہیں
دل ہے وہی پاک ہو محبت جسمیں | اچھی ہے وہ بات ہو صداقت جسمیں
اُلفت میں اگر ملے مہد سمجھ | گر زہر محبت میں ملے شہد سمجھ
اسرارِ خدا کی ہے یہی اک کنجی | کھُلتا ہے اسی سے قفلِ کنزِ مخفی
احببت ان اعرف ست راز الفت | شد طرز حدوث از طراز الفت

یا ایہا الذین امنو آمنوا باللہ و رسولہ کے تحت شریعت کے ساتھ ساتھ جس طرح طریقت کا پہلو ظاہر کیا گیا ہے ذیل کی نظم میں ملاحظہ ہو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے شریعت و طریقت دونوں جزو کی تکمیل ضروری ہے۔

خوش ہم سے رہے جاناں ہم عید اسے کہتے ہیں
بس ایک کے ہو جانا توحید اسے کہتے ہیں
گرنا ترے قدموں پر ہے عین نماز اپنی
ہے اس میں سرافرازی اے بندہ نواز اپنی
بھولے سے نہیں آتا کھانے کا خیال اب تو
دھُن وصل کی رہتی ہے ہے صوم وصال اب تو
مرجانا محبت میں ہے عین حیات اپنی
نقد دل و جان دینا گویا ہے زکوٰۃ اپنی
عاشق کیلئے حج بھی اک خاص بہانہ ہے
ہم کو درِ جاناں تک ہر حال میں جانا ہے

کام آنہ سکی آخر کچھ بخیہ گری اپنی
لے جاتی ہے جنگل کو شوریدہ سری اپنی
حلقہ در کعبہ پہ ہے حلقہ بگوشوں کا
ہے زانوئے دلبر پہ سر خانہ بدوشوں کا
اے مست مے وحدت امجد تجھے کیا کم ہے
کوثر ہے مدینہ میں اور کعبہ میں زمزم ہے
تفسیر ہو یا قرآں سب ایک ہی مطلب ہے
اسلام کے ارکان ہیں یا عشق کا مذہب ہے
جو کچھ ہے شریعت میں وہ عین طریقت ہے
توحید محبت ہے توحید محبت ہے

شایاں نہ بود ما را بے صدق دعا کردن
بے شائبہ الفت از فرض ادا گشتن

حضرت امجد نے ایک نظم "میرا رام کہاں ہے" کے عنوان سے لکھی ہے نیچرل حالت کا نقشہ جس طرح صاف کھینچا گیا ہے اور پھر تصوف کے اہم مسئلہ "ہمہ اوست" کی جسطرح صراحت کیگئی ہے وہ قابل غور ہے ملاحظہ ہو۔

رات جب لوگ سوتے تھے سارے | چپ کھڑی تھی میں گنگا کنارے
لہریں لیتا تھا دریا کا پانی | جوش پر تھی ندی کی جوانی
چاند پانی میں تھا عکس افگن | مائی گنگا کا تھا نور جوبن

دیکھ کر ایسا دلکش نظارہ　　شدتِ غم سے میں نے پکارا
روح بسمل ہے جان نیم جاں ہے
میں یہاں رام میرا کہاں ہے

چرخ پر گھومنے والے بادل　　مہ کا منہ چومنے والے بادل
آسماں تک ہے تیری رسائی　　خاک افتادہ میں نارسائی
عرش اعلیٰ پہ تیری نظر ہے　　فرش خاکی پہ دکھیا کا سر ہے
یوسف گم شدہ کا پتہ دے　　ڈھونڈھ کر مجھ کو اتنا بتا دے
چاند کس برج میں وہ نہاں ہے
میں یہاں رام میرا کہاں ہے

اے لو کس زور سے بجلی کڑکی　　روح قالب میں گھبرا کے پھڑکی
بوندیں پڑتی ہیں جھم جھم زمیں پر　　آسماں ہو گیا خم زمیں پر
چھائی ہے کیا گھٹا کالی کالی　　چاند نے ڈر کے صورت چھپا لی
خوف سے میرا دل ہی ہے مضطر　　میں چھپوں کس کے دامن میں جا کر
آہ کس جا مرا جانِ جاں ہے
میں یہاں رام میرا کہاں ہے

کوئی بے کس کا رہبر نہیں ہے　　مہرباں کوئی مجھ پر نہیں ہے
لاکھ رو رو کے میں نے پکارا　　محوِ غفلت ہے سنسار سارا
یاس کی اوس برسی جو دل پر　　دی صدا رعد نے یہ گرج کر

دیکھ ہے پرمیشور مجھ میں تجھ میں — رام تجھ میں ہے رام مجھ میں
رام ہے جان میں رام تن میں — رام جل تھل میں ہے رام بن میں
رام کا ذکر ہر نام میں ہے — رام سب میں ہے سب رام میں ہے
جلوہ اسکا بد و نیک میں ہے — شان اس ہر کی ہر ایک میں ہے

کس لئے پھر یہ شور و فغاں ہے
میں یہاں رام میرا کہاں ہے

بعض انسان رنج و غم سہتے سہتے نظریہ غالب کے تحت ۵

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پہ کہ آساں ہو گئیں

کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور بعض پر نظریہ مذکور پورا نہیں اترتا بلکہ رو رو کر کرب کے پیہم صدمات سے اسکی روح دن بدن تحلیل ہوتی جاتی ہے۔ تعجب تو یہ ہے کہ ایک ہی چیز دو متضاد چیزوں کی علت بنتی ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رنج سہتے سہتے آخر رنج سہنے کی عادت ہو گئی یہ بھی صحیح ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ رنج سہتے سہتے آخر موت کے کنارے لگ گئے یہ بھی صحیح ہے۔

قل متاع الدنیا قلیل کے تحت حضرت امجد نے اس دوسرے فرقہ والوں کو جس طرح صبر اور سکون کی تعلیم دی ہے واقعہ تو یہ ہے کہ سچ مچ پڑھنے والے کو ایک قسم تسکین نصیب ہو جاتی ہے۔

راہِ خدا میں زندگی مستعار دے — چھننے سے پہلے جامۂ ہستی اتار دے
بہر رفاہ خستہ دلاں اشتہار دے — غم دیدہ دل کے کان میں امجد پکار دے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

آئے زمیں پہ خاک اُڑانے کے واسطے　　آنکھیں بنی ہیں اشک بہانے کیواسطے
یہ زندگی ہے رنج اٹھانے کے واسطے　　ہر سانس تن میں آتی ہی جانے کیواسطے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

مانا کہ غم میں حد سے سوا مبتلا ہے تُو　　بےکس ہے تو فقیر ہے تو بے نوا ہے تُو
کیوں جانِ مستعار سے اے دل خفا ہے تُو　　اے رونے والے موت کو بھولا ہوا ہے تُو
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

مانا کہ تو شکستہ دل و خستہ حال ہے　　مانا کہ مثلِ نقشِ قدم پائمال ہے
مانا کہ ہجرِ یار میں جینا محال ہے　　دو دن فراق کے ہیں پھر آخر وصال ہے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

اے جان! جان رنج میں کھوتی ہے کس لئے　　بے چین ضبط درد سے ہوتی ہے کس لئے
ناؤ اپنی بحرِ غم میں ڈبوتی ہے کس لئے　　اے شمع صبح ہوتی ہے، روتی ہے کس لئے
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

یہ قدِ راست بارِ مصائب سے خم سہی　　آفت پہ آفت اور ستم پر ستم سہی
پاؤں میں چھالے دل میں خلش لب پہ دم سہی　　اے چلنے والے اور ذرا دو قدم سہی
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

پیوند خاک کا ہے یہاں نیک ہو کہ بد　　اے سونے والے مہد کا انجام ہے لحد
اے جینے والے مردوں پہ کرتا ہے کیوں حسد　　شاید ہمیں نفس واپسیں بود
تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

ایک نظم کا عنوان ہی "سہ رنگی تصویر" نظم کیا ہی کیسی ہے؟ اس کا اندازہ خود ناظرین کرلیں۔

(۱) پہلا رنگ نہایت ہلکا غنچۂ ناشگفتہ کی طرح پاک اور برف کیطرح بے داغ تھا۔

سن کتھا میری اچھی سہیلی — رات میں سو رہی تھی اکیلی
آئی خوشبو مجھے عطر کی سی — چھو گئی سانس مجھ کو کسی کی
چھا گئی مجھ پہ بدلی کرم کی — بند آنکھوں میں بجلی سی چمکی
ہوگیا فضل باری تعالیٰ — آیا گھر میں مرے عرش والا

(۲) دوسرا رنگ نہایت شوخ مگر کچا دھوپ میں اُڑ جانے والا۔ میری انتہائی مسرت اور اس کے معنی خیز تبسم پر شامل تھا۔

محو دیدارِ رُخ یار ہوں میں — خواب میں ہوں کہ بیدار ہوں میں
اب جلے آگ میں میری سوتن — میں تو باندھوں گی دامن سے دامن
اب کہیں اسکو جانے نہ دونگی — غیر کو منھ دکھانے نہ دوں گی
غمکدے میں مرے عید ہوگی — اب تو آٹھوں پہر دید ہوگی

(۳) تیسرا رنگ نہایت گہرا اور پختہ دہونے سے بھی نہ دُھلنے والا۔ خون کی طرح جسم کی رگ رگ میں دوڑنے والا تھا۔

میں اس وجد میں جھومتی تھی — اپنی قسمت کا منہ چومتی تھی
ناگہاں اک ذرا آنکھ جھپکی — کڑکڑا کر گری غم کی بجلی
ہائے تقدیر نے رنگ بدلا — پھر یہ دیکھا کہ اس کو نہ دیکھا
اس نے جلوہ دکھایا ہی کیوں تھا — جانے والا پھر آیا ہی کیوں تھا
بیٹھے بیٹھے مرا جی جلایا — چھپنے والے نے کیوں منہ دکھایا

اب وہ ہم ہیں نہ وہ ہمنشیں ہے ہائے سب ہو گئے پھر کچھ نہیں ہے

یقین ہے اس سے حضرت امجد کے نظموں کی وضاحت ہو جائے۔

تضمین: ۔حضرت امجد کی نظمیں پیش ہو چکی ہیں اب ہم آپ کی تضمینیں اور غزلیں پیش کرتے ہیں۔

تضمین اس کو کہتے ہیں جو دوسرے شعرا کے کلام پر مصرعے لگائے جائیں یہ ضروری نہیں کہ جس زبان کی غزل ہو اسی کے ہمزبان مصرعے ہوں۔ بلکہ عربی اور فارسی کے ساتھ بھی اردو مصرعے لگا کر تضمین کی جا سکتی ہے۔

جہاں تک ہمارے معلومات ہیں اردو شعرا نے بہت کم اس قسم کا کلام چھوڑا ہے۔ حضرت امجد کے ریاضِ امجد حصہ اول اور حصہ دوم میں متعدد تضمین ہیں جن میں عربی فارسی اور اردو پر مصرعے لگائے گئے ہیں۔ یہ تضمین تمام تر نعت اور تصوف پر مشتمل ہیں۔ اکثر مجلس سماع میں جب یہ گائی جاتی ہیں تو مجلس کو حالتِ کیف میں لا کر وجد پیدا کر دیتی ہیں یہ تضمینیں خاص عنوانات کے تحت لکھی گئی ہیں۔ بعض عنوان حسب ذیل ہیں۔

جذبات محسن۔ بیمار کربلا کی زبانی۔ گیسوؤ والے آجا۔ بت ہم برہمن ہم۔ تو زغنچہ کم نہ دمیدہ۔ دیوانہ سازی خویش را۔ حاجت بیا زنیست۔ کل من علیہا فان۔ وابیضت علینا من الحزن۔ مازاغ البصر۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین وغیرہم۔

ان میں سے بعض کو متعارف کیا جاتا ہے۔

عربی ۔عربی شاعری میں حضرت علی کرم اللہ وجہ کا نہایت بلند مرتبہ ہے اور آپ کی فصاحت

بلاغت ادب میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔ حضرت امام زین العابدینؒ کو گویا ازثاً شاعری ودیعت ہوئی تھی۔ آپ کا ایک عربی قصیدہ نہایت مشہور ہے۔ اس پر حضرت امجد کی تضمین ملاحظہ ہو۔

اے پیک نیک بیکساں اے قاصد فرخ شیم
مرہون احسانت جہاں ممنون انعامت امم
شبدیز چابک سیر تو گہہ در عرب گہہ در عجم
ان نلت یا ریح الصبا یوماً الی ارض الحرم

بلغ سلامی روضۃ فیہا النبی المحترم

فرقت میں جاں برباد ہی آیا ہی اب آنکھوں میں دم
جا کر سنائے کون انہیں افسانۂ بیمار غم
پیغامبر ملتا نہیں بیچارہ و بے کس ہیں ہم
ان نلت یا ریح الصبا یوماً الی الارض الحرم

بلغ سلامی روضۃ فیہا النبی المحترم

کیا شکل کھینچی واہ واہ قربان ترے دست قضا
پڑھتے ہیں جسکو دیکھ کر حور و ملک صل علیٰ
کیا رنگ ہے کیا روپ ہے کیا حسن ہے نام خدا
من وجہہ شمس الضحیٰ من خدہ بدر الدجیٰ

من ذاتہ نور الہدیٰ من کفہ بحر الہمم

کیا پوچھتے ہو ہمدمو ہم سے محبت کا مزہ
دل چاک ہے ٹکڑے جگر تن زخمی تیغ جفا
سننا دہانِ زخم سے رہ رہ کے آتی ہی صدا
اکبادنا مجروحۃ من سیف ہجر المصطفیٰ

طوبیٰ لاہل بلدۃٍ فیہا النبی المحترم

کل امجد بے خانماں ناگاہ رستہ میں ملا
آشفتہ و شوریدہ سر مضطر پریشاں بینوا
پوچھا جو ہم نے حالِ اُس درد کے یوں کہنے لگا
اکبادنا مجروحۃ من سیف ہجر المصطفیٰ

طوبیٰ لاہل بلدۃٍ فیہا النبی المحترم

پیراہن دل چاک ہی ٹکڑے ہے جیب و آستیں
جینے سے جی بیزار ہے ہونٹوں پہ ہے جانِ حزیں

اچھے مسیحا بے رخی بیمار سے اچھی نہیں   یا رحمۃ للعالمین ادرک لزین العابدین
محبوس ایدی الظالمین فی الرکب والمزدحم

فارسی۔ خواجہ حافظ شیرازی فارسی کے وہ مشہور معروف شاعر ہیں جنکا تمام کلام اپنی رنگینیٔ جذبات۔ بلند پروازی تخیل اور لطفِ زباں اور عاشقانہ مضمون آفرینی کے باعث نہایت مقبول ہے۔ خواجہ صاحب کو کوئی ان کے کلام کے لحاظ سے رند خراباتی تصور کرتا ہے تو کوئی صوفی صافی کوئی آپ کے جام میں مے ارغوانی کا سرور پاتا ہے تو کوئی اسی ساغر میں آبِ کوثر اور شراب طہور کی جھلک دیکھتا ہے۔

حضرت امجد نے آپ کی بعض مشہور غزلوں پر تضمین کی ہے۔ حق یہ ہے کہ حافظ کی غزل کے لئے امجد کے مصرعے ہی اس کو تضمین کرنیکے لئے موزوں اور مناسب تھے۔ اس تضمین سے حافظ کی غزل کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور شیراز کی مے دوآتشہ دکن کے خم خانہ میں سہ آتشہ ہوجاتی ہے۔

نثار عارضِ گلرنگ تو ہزار انند   شہید تیغ نگاہِ تو گلعذار آنند
اسیر حلقۂ زلف تو رستگار انند   غلامِ نرگسِ مست تو تاجدار انند
خراب بادۂ لعل تو ہشیار انند

چھپایا لاکھ مگر چھپ سکا نہ عشق کا راز   تمام حالتِ دل تاڑ ہی گئے دمساز
تری خطا، نہ مرا جرم اے بتِ طناز   ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز
دگرنہ عاشق و معشوق راز دار انند

تڑپتی ہے تری فرقت میں خلق شام و سحر   کوئی حزیں کوئی بیتاب کوئی خاک بسر

تجھے نہیں ہی مگر اپنے عاشقوں کی خبر
بزیرِ زلفِ دوتا چوں گذر کنی بنگر
کہ از یمین و یسارت چہ بیقراراں اند

پھڑک رہے ہیں اسیرانِ کاکُلِ مشکیں
نکلنے کو ہے تنِ مضمحل سے جانِ حزیں
جو میری بات کا ظالم تجھے یقین نہیں
گذار کن چو صبا بر بنفشہ زار و ببیں
کہ از تطاولِ زلفت چہ سوگواراں اند

یہ کیا کہا کہ میں ہوں آج صاحبِ ثروت
نہیں ہے کوئی زمانے میں مجھسا با عزت
تجھے نصیب کہاں وصلِ یار کی دولت
رقیب درگذر و بیش ازیں مکن نخوت
کہ ساکناں درِ دوست خاکساراں اند

ہے ہم سے نور فزا شمعِ مغفرت پرتوَ
سیاہ کاروں سی ہے آفتابِ عفو میں ضَو
شراب خواروں سے کوثر کو ہے لگی ہوئی لَو
نصیب ماست بہشت اے خدا شناس برو
کہ مستحقِ کرامت گناہ گاراں اند

تباہ ہیں تری فرقت میں سینکڑوں بیکس
شکستہ حال پریشان خیال تنگ نفس
جہاں میں کون ہی جسکو نہیں ہے تیری ہوس
نہ من برآن گلِ عارض غزل سرایم و بس
کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزاراں اند

ہے چاک دل کیطرح زندگی کا پیراہن
مثالِ نقشِ قدم آہ پائمال ہے تن
وطن ہی دُور ہیں ہر سمت راہ میں رہزن
تو دستگیر شو اے خضرِ پے خجستہ کہ من
پیادہ میروم و ہمرہاں سواراں اند

ترے خیال میں مرجائے امجد ناشاد
الٰہی یوں ہی رہے خاک عاشقاں برباد
دلِ حزیں نہ ہو غم سے ترے کبھی آزاد
خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد

کہ بستگان کمند تو رستگار انند

دیگر

برسوں تری فرقت میں کی بادیہ پیمائی
ہر جا تجھے ڈھونڈا ہم نے بت ہر جائی
افسوس تیری صورت اکدن نہ نظر آئی
رخصت ہوا دنیا سے آخر تیرا شیدائی
کن بر سر تابوتم یک جلوہ برعنائی
اے در لب لعل تو اعجاز مسیحائی
بیمار محبت کی اک روز نہ یاد آئی
اکدن بھی عیادت کو تکلیف نہ فرمائی
تا زیست کبھی ظالم صورت ہی نہ دکھلائی
آ۔ اب تو کرم فرما۔ او شاہد ہر جائی
کن بر سر تابوتم یک جلوہ برعنائی
اے در لب لعل تو اعجاز مسیحائی
آ۔ اے بت سنگیں دل آ۔ فاتحہ پڑھتا جا
اعجاز لب نازک بے جان کو دکھلا جا
پامال محبت کو پھر ناز سے ٹھکرا جا
پھر پیکر بے جاں میں آجائیگی جاں آجا
کن بر سر تابوتم یک جلوہ برعنائی
اے در لب لعل تو اعجاز مسیحائی
اتنا بھی نہ عاشق کو نظروں سے گرا ظالم
دو پھول چڑھانے سے تیوری نہ چڑھا ظالم!
بیمار غم ہجراں دنیا سے چلا ظالم
امجد کے جنازے پر للہ اب آ ظالم!
کن بر سر تابوتم یک جلوہ برعنائی
اے در لب لعل تو اعجاز مسیحائی

ایک اور فارسی تضمین ملاحظہ ہو۔

داری سر فرزانگی دیوانہ شو دیوانہ شو
بگذر ازیں دیوانگی فرزانہ شو فرزانہ شو
ایجاں زحد جاں گزر جانانہ شو جانانہ شو
ای حق طلب از غیر خود بیگانہ شو بیگانہ شو

برشمع ہستی چرخ زن پروانہ شو پروانہ شو

جو اصل جوہر ہے ترا نا قابل تغیر ہے ۔ یہ چاندسی صورت تیری نقاش کی تصویر ہے

قدرت کی تو تحریر ہے وحدت کی تو تفسیر ہے ۔ رفع حجاب غیر کی بس اک یہی تدبیر ہے

برشمع ہستی چرخ زن پروانہ شو پروانہ شو

اس شیشۂ ناموس کو سنگ جنوں سے پھوڑ دے ۔ یہ رشتۂ تارِ نفس دامانِ حق سے جوڑ دے

کون و مکاں میں کھیل جا محدودیت کو چھوڑ دے ۔ اے نورِ حسن لم یزل فانوس بھی توڑ دے

برشمع ہستی چرخ زن پروانہ شو پروانہ شو

ہے حاملِ عرش بریں خاکی منش ہستی تری ۔ ہے یادگار بادۂ توحید سرمستی تری

ہر دم صفاتِ سبعہ سے آباد ہی بستی تری ۔ اللہ اکبر دیکھ تو کیا چیز ہے ہستی تری

برشمع ہستی چرخ زن پروانہ شو پروانہ شو

حیران اپنی شان سے آئینہ سا حیران ہو ۔ اپنے حریم دل میں آ آپ اپنا مہمان ہو

امجدؔ تلاشِ حق میں اب ناحق نہ سرگردان ہو ۔ تو آپ اپنی قدر کر تو آپ پر قربان ہو

برشمع ہستی چرخ زن پروانہ شو پروانہ شو

اُردو عربی اور فارسی تضمینوں کے بعد اب ہم اُردو کی تضمین پیش کرتے ہیں۔

حضرت محسنؔ کاکوری اُردو کے وہ مشہور نعت نویس شاعر ہیں جن کے متعلق کسی مزید تعارف کی ضرورت نہیں آپ کا کلام دنیائے اُردو میں حسنِ مقبولیت کی سند رکھتا ہے، آپ کا ایک زبردست قصیدہ نعتیہ ہے جو اپنے سنگلاخ قافیہ کے باعث نہایت مشہور ہے اس پر حضرت امجدؔ کی تضمین ملاحظہ ہو۔

دو عالم میں ہے ایک شہرہ تری حُسن مجدد کا خدائے دو جہاں کرتا ہے نظارہ تیرے قد کا
مبرّا آب و گل سے ہے ہیولا ذات ارشد کا محمدؐ مصطفےٰ پتلا ہے تو نور مجدّد کا
ہوا خورشید اقلیم عدم سایہ تیرے قد کا

خلش میری طرف سے دوستو دل میں نہ آنے دو طبیعت آزمائی کچھ نہیں اہیں جو سچ پوچھو
یہ کب منشا تھا میرا شاعرانہ کوئی جدّت ہو بمجبوری لکھا اَحَد کی صورت لفظ اللہ کو
نہ آیا ہاتھ اچھا قافیہ جب کوئی احمد کا

نہیں ذات احد کچھ دور احمد کی حقیقت سے الف اللہ کا ملتا ہے بالکل تیرے قامت سے
مقدم ہے تری تکوین لفظ کن کی خلقت سے کھنچی پہلے تری تصویر ازل میں دست قدرت سے
ہوا لفظ خدا سے اشتقاق اول ترے خد کا

کئے پہلے پہل حق نے ہزاروں انبیا پیدا کیا نظارہ پھر تفصیل سے ہر اک کی سج دھج کا
جچا کوئی نہ نظروں میں نہ بھایا ایک بھی نقشا مٹا ڈالیں بنا کر صورتیں آدم سے تا عیسیٰ
تب آیا راست نقشا کلک قدرت سے ترے قد کا

فلک کو چاند تاروں سے زمیں کو گل سے زینت دی عطا کی لہلہاتے کھیت سے جنگل کو سرسبزی
مٹایا داغ کثرت شمع وحدت کو ضیا بخشی خدا نے زیب و زینت کی جو بزم آفرینش کی
لگایا اس میں قد آدم آئینہ ترے قد کا

شعاع مہر خاور کا چلے جب حلق پر خنجر بغل میں ہو ہر اک کے نامۂ اعمال کا دفتر
کھرے کھوٹے کی جب ہو جانچ پیش حضرت داور بہ رنگ زر چڑھے سونا میرا میزان محشر پر
اُٹھوں میں قبر سے مخمور تیری چشم اسود کا

پیام یار لائے روشنائی میرے نامہ کی کوئی جدّت دکھائے روشنائی میرے نامہ کی

لطافت ایسی پائے روشنائی میرے نامہ کی　　　الٰہی کھیل جائے روشنائی میرے نامہ کی
بڑا معلوم ہو لفظ احد میں میم احمد کا

حیدرآباد کے ایک صوفی بزرگ حضرت شمس الدین فیضؔ تھے آپ اپنے عہد کے زبردست شاعر ہوئے ہیں۔ دیوان شائع ہوچکا ہے ۱۲۸۰ھ میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کی ایک غزل "بت ہم برہمن ہم" نہایت مشہور اور مقبول ہے اس پر حضرت امجدؔ کی تضمین ملاحظہ ہو:-

کریں کسکی محبت میں عبث فریاد و شیون ہم　　　پھریں آوارہ ہوکر کسکی خاطر کوہ و برزن ہم
ادب سے سامنے کسکے جھکائیں اپنی گردن ہم　　　کریں ہم کسکی پوجا اور چڑھائیں کسکو چندن ہم
صنم ہم دیر ہم بت خانہ ہم بت ہم برہمن ہم

سوا اپنے نہیں ہم چشم کوئی اپنا بیگانہ　　　خدا کی شان اب تو جام جم ہے چشم مستانہ
جدھر دیکھو نظر آتا ہے ہر سو روئے جانانہ　　　در و دیوار ہے نظروں میں اپنی آئینہ خانہ
کیا کرتے ہیں گھر بیٹھے ہوئے آپ اپنا درشن ہم

نہ فکر دین و دنیا ہے نہ کچھ اعمال سے مطلب　　　غرض کوئی گذشتہ سے نہ استقبال سے مطلب
نہ حجت سے ہی دلچسپی نہ استدلال سے مطلب　　　نہ قیل و قال سے مطلب نہ شغل اشغال سے مطلب
مراقب اپنے رہتے ہیں جھکا کر اپنی گردن ہم

کسی کے عشق میں سنتے ہیں طعنے دوست دشمن کے　　　گریباں چاک ٹکڑے آستین پرزے ہیں دامن کے
گرے ہیں اشک آسا بیٹھے ہیں نقشِ قدم بنکے　　　کب اٹھتے ہیں اٹھانے سے کسی شیخ و برہمن کے
در دلبر پہ اپنے مار کر بیٹھے ہیں آسن ہم

جنہیں ڈھونڈا کیا دیر و حرم میں دلنشیں تھے وہ سمجھتے تھے جنہیں ہم دور تر ہم سے قریں تھے وہ
جہاں کی خاک چھانی عشق میں جنکی یہیں تھے وہ ہُوا اے فیض معلوم ایک مدت میں ہمیں تھے وہ
جپا کرتے تھے جنکے نام کی دن رات سمرن ہم

ایک اور تضمین ملاحظہ ہو جو مازاغ البصر کے عنوان سے لکھی گئی ہے۔

اے مہِ یثرب رسولِ ہاشمی بانکے جواں کیا ڈھلی ہیں سحر کے سانچے میں تیری پتلیاں
پار ہو جاتی ہے دل کے تیرِ مژگاں کی سناں تیری چشمِ مست سے بے ہوش ہے سارا جہاں
او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے

چھا گیا سارے جہاں میں رحمتِ حق کا سحاب تیرے چھینٹوں نے بجھایا بولہب کا التہاب
تیری آمد سے ہوئے عالم میں کیا کیا انقلاب اک نظر میں سینکڑوں کو کر دیا مست خراب
او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے

فتنے پیدا کرتی ہے عالم میں چشمِ پُر فتن کیف سے جس کے نشہ ہی ہوش والوں کا ہرن
کیوں نہ قدموں پر گریں تیرے تڑپ کر مرد و زن کہہ رہی ہے تیری چشمِ مست خَرُّوا سُجَّدًا
او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے

مردے جی اُٹھتے ہیں چشمِ مست کے انداز سے پتلیاں دونوں بھری ہیں سحر اور اعجاز سے
بجلیاں گرتی ہیں دل پر دیدۂ طناز سے کس قدر پامال ہیں تیری نگاہِ ناز سے
او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے

چشمِ افسوں گر کے افسوں کی عجب تاثیر ہے کوئی گریاں کوئی محوِ نالۂ شبگیر ہے
تیرِ مژگاں کا کوئی بسمل کوئی نخچیر ہے خَرَّ موسیٰ کی جہاں میں ہر طرف تصویر ہے

او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے

تیری آنکھوں میں لگا ہے کحل مازاغ البصر · میں ہوں ان آنکھوں کے قربان ہاں ادھر بھی اک نظر

کیا بتاؤں ہائے ان نیچی نگاہوں کا اثر · امجدؔ شیدا ہو جامی تیرِ خوردہ در جگر

او نشیلی آنکھ والے کچھ تجھے بھی ہوش ہے

غزلیات ۔ اب ہم حضرت امجدؔ کی غزلوں کو پیش کرتے ہیں۔ چونکہ اُردو شاعری کی بنیاد فارسی پر رکھی گئی تھی۔ اسلئے جو لوازم فارسی شاعری کے تھے، انکا تمامترؔ اُردو میں منتقل ہونا ناگزیر تھا مگر چونکہ یہ نقل تھی اس لئے وہی فرق ہو گیا جو اصلی اور نقلی میں ہو سکتا ہے اگرچہ بعض شعراء نے نہایت کامیاب نقل کی ہے۔ ہماری اُردو شاعری کے لئے وہی شیریں فرہاد اور لیلیٰ مجنوں کی عشقیہ داستانیں منصور کا نعرۂ انا الحق۔ رستم کی بہادری، جمشید کا جام، فریدوں کی شوکت، دارا کی حشمت، نوشیرواں کا عدل حاتم کی سخاوت، معانی و بہزاد کی مصوّری، اور وہی ایرانی شاہد وساقی، وہی مے ناب ارغوانی، وہی گل وبلبل کے افسانے، وہی زاہد وعابد کی چشمک، وہی محتسب و رند کی نااتفاقی، شیخ اور امرد پرستی کے کرشمے لازمۂ شاعری بن گئے جس کی وجہ سے اصلیت مفقود اور حقیقت نابود ہو گئی۔ اسکے بجائے نل دمن اور چندر بدن و مہیار کی عشقیہ کہانی سرمد کی گردن فروشی۔ جہانگیر کا عدل۔ اکبر کی شوکت۔ عالمگیر کی حشمت۔ شاہجہاں کی سخاوت۔ آسکتی تھی۔ ان میں اصلیت رہتی اور اصلیت کے باعث تاثیر میں زمین و آسمان کا فرق ہو جاتا۔

اُردو شاعری کے لئے دوسری مشکل معشوق کا عدم وجود ہے۔ پردے کے باعث سوائے

شاہدان بازاری کے کسی معشوق کا دستیاب ہونا اور رہا تھہ آنا دشوار بلکہ ناممکن تھا اور پہران کی بے وفائی ہرجائی کے گلے او شکوے لازمۂ شاعری بن گئے اس طرح غزل پوری طرح ہزل بن گئی۔

غزل کی عام تعریف یہی ہے کہ معشوق سے رازو نیاز۔ اسکی مدح وستائش اسکے نازو انداز کا بیان اسکے غمزہ اور کرشمے کا ذکر جب معشوق ہی نہ ہوں تو ظاہر ہے یہ سب بیان بناوٹی اور فرضی ہوتا ہے، یہ تمام وجوہ تھے کہ عموماً اردو شاعری خصوصاً متوسطین کی شاعری اصلی شاعری نہیں رہی اور اس وجہ سے اسپر جگ ہنسائی ہونے لگی۔

ہم اس امر کو بیان کر چکے ہیں کہ حضرت امجد صوفی ہیں۔ اور اسکے ساتھ شاعر بھی۔ آپ کی شاعری میں اول تو غزلوں کی مقدار نہایت قلیل ہے اور پہر بقول حضرت ممدوح وہ غزل کو ہزل تصور کرتے ہیں اس لئے آپ کی غزلیں ان تمام حشو و زوائد سے پاک و صاف ہیں جن سے وہ عام طور پر مملو ہوتی ہیں۔ پھر بھرتی کے اشعار سے وہ بالکل خالی ہوتی ہیں۔ آپ کی غزل ہی تصوف اور فلسفہ کا معدن حقیقت اور اصلیت کا خزانہ ہوتی ہے۔ ہر شعر میں بجلی کی سی چمک اور تڑپ پائی جاتی ہے وہ سوز و گداز کی بولتی تصویر ہوتی ہے۔ ان سے وہ راز پنہانی جلوہ نما ہوتے ہیں۔ جن تک رسائی اور پردہ دری ہر ایک کا کام نہیں ہوتا۔ بلکہ وہی اس راز کو افشا کرتے ہیں جو دیدۂ بصیرت رکھتے اور اپنی ان آنکھوں سے معشوق حقیقی کا اصلی جمال جہاں آرا اور جلوہ جاناں مشاہدہ کرتے ہیں اور جب اصلیت کا اظہار ہوگا تو ظاہر ہے وہ کلام کیا پایہ رکھ سکتا ہے اور پہر جہاں اصلیت رکھتا ہے وہاں ان میں سادگی اور عام فہمی بھی ہے وہ ایسے نہیں ہیں جن کے سمجھنے کے لئے کلام غالب کی طرح شرح کی ضرورت ہو۔ ان کا کمال یہ ہے کہ وہ عام فہم

اور صاف ہیں اور پھر فلسفہ اور تصوف کے مشکل ترین مسائل کے حامل بھی۔ وہ تخیل کے لحاظ سے بلند سے بلند درجہ رکھتے ہیں اور اسکے باوجود اصلیت سے دُور نہیں اور رنگینی اور لطفِ زبان سے خالی نہیں آپ نے اس امر کو بخوبی ثابت کر دیا ہے کہ معمولی بول چال کی زبان کس طرح غزل کا بارِ امانت اُٹھا سکتی ہے۔

اس تفصیل کے بعد ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں آپ کا مختصر کلام پیش کرتے ہیں۔

غالب کی ایک مشہور غزل ہے۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اسی "طرح" میں حضرت امجد کی ایک غزل ہے فرماتے ہیں۔

نالہ جانِ خستہ جاں عرش بریں پہ جائے کیوں
میرے لئے زمین پر صاحب عرش آئے کیوں

نور زمین و آسماں دیدۂ دل میں آئے کیوں
میرے سیاہ خانہ میں کوئی دیا جلائے کیوں

دیکھے تجھے جو اک نظر ہوش میں پھر وہ آئے کیوں
جسکو ترے قدم ملیں سجدے سے سر اٹھائے کیوں

یہ تیسرا شعر گویا بالکل حقیقت ہے، کیونکہ حبیب خدائے لم یزل کا دیدار جس کو میسر ہو پھر وہ ہوش میں آ ہی نہیں سکتا۔ موسیٰ صرف ایک جلوہ میں بیہوش ہو جاتے ہیں طور سرمہ ہو جاتا ہے تو اسکی اصلیت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے اور جب شاہدِ اصلی کے قدم مل جائیں تو سجدے سے سر اُٹھانے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔

خدا کا نام غفور ہے اسلئے جرم کی معافی اور عصیاں کا عفو لازمی ہے اس حقیقت کو اس طرح واضح کیا گیا ہے۔

بخشنے والا جب مرا عفو یہ ہی تُلا ہوا مجھ سا گنہگار پھر جُرم سے باز آئے کیوں

اس غزل کا یہ شعر خصوصیت کے ساتھ قابل ملاحظہ ہے۔

زخم کو گھاؤ کیوں بناؤ درد کو اور کیوں بڑھاؤ نسبت ہُو کو توڑ کر کیجئے ہائے ہائے کیوں

اور پھر

جس نے چڑھائیں تیوریاں نام سے میرے عمر بھر اب وہ مرے مزار پر پھول چڑھانے آئے کیوں

مقطع کس غضب کا ہے۔

امجد خستہ حال کی پوری ہو کیونکر آرزو دل ہی نہیں جب اسکے پاس مطلب دل بر آئے کیوں

حضرت امجد ۱۳۴۵ھ میں حج و زیارت سے مشرف ہو چکے ہیں۔ ذیل کی غزل خاص مدینہ منورہ میں لکھی گئی ہے اس کا ہر شعر اصلیت رکھتا ہے اور پھر عجمی نعرۂ منصور نہیں بلکہ ہندی صوت سرمدی پیش کیا گیا ہے۔

مل گیا صوت سرمدی میرے شکستہ ساز سے نغمے کی آتی ہے صدا نوحۂ دل گداز سے

جب کسی کی محبت دل میں جا بستی ہے اور رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے تو سوائے محبوب کے جلوہ کے کچھ اور نظر ہی نہیں آسکتا ہر طرف اور ہر شے میں محبوب کی صورت ہی نظر آتی ہے اسی فلسفہ کو اس شعر میں ادا کیا گیا ہے۔

اب تو مری نظر میں ہی حُسن ہی حُسن ہر طرف خلعت عشق مل گیا بارگہ حجاز سے

پھر اسکی مزید تشریح ہوتی ہے۔

حاصل عمر مل گیا قلب فسردہ کھل گیا پڑ گئی زندگی میں جان انکی نگاہ ناز سے

برسوں کے بچھڑے مل گئے داغ دلو نکے دُھل گئے لپٹی ہے انکی خاک پا میرے سر نیاز سے

شکستگی ہمیشہ جوڑی جاتی ہے۔ شکستگی کبھی جڑتی نہیں مگر دل کی شکستگی معشوق حقیقی سے کس طرح جوڑتی ہے۔ اور اس در نیم باز سے شاہد حقیقی کو کس طرح دیکھا جاتا ہے اس مضمون کو ان شعروں میں ادا کیا گیا ہے۔

دیکھ لیا رُخ حسین اس در نیم باز سے — دل کی شکستگی نے آج جوڑ دیا کسی کے ساتھ

ہمنے ملا دیا تجھے لے تیرے چارہ ساز سے — حالت وجد و ذوق میں دل سے یہ کہہ رہا ہے درد

بربط روح بھر گیا نغمۂ دل نواز سے — امجد نیم جاں کی جاں رقص نہ کیوں کرے یہاں

غالب کی ایک اور غزل ہے جس کا مطلع ہے۔

داغ دل بے درد نظر گاہ حیا ہے — شبنم بہ گل لالہ نہ خالی ز ادا ہے

حضرت امجد کی ایک غزل بھی اسی "طرح" میں ہے فرماتے ہیں۔

لیکن نہیں معلوم کہ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ — ہے، اور یقینی ہے یہی سب کی صدا ہے

ہاتھ آئے تو بت، ہاتھ نہ آئے تو خدا ہے — کیا کوئی کہے، اسکی حقیقت کہ وہ کیا ہے؟

خدائے تعالیٰ (برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم) کی حقیقت یا کنہ بیان کرنا انسانی امکان سے خارج ہے۔ لیکن پھر بھی حضرت امجد نے جس طرح حق سبحانہٗ تعالیٰ کی تعریف فرمائی ہے وہ انہی کا حق ہے۔ موجود کی دو قسمیں ہیں محسوس اور غیر محسوس ہر وہ چیز جو محسوس اور حواس میں آسکتی ہے وہ بت اور مادیت ہے۔ اور جو حواس اور خیال اور قیاس اور وہم سے بری ہے وہ موجود مطلق ہے۔ اس جگہ ہاتھ آئے اور ہاتھ نہ آنے کے یہی معنی ہیں۔

دُنیا میں ہر طرح کے سامان عیش فراہم ہیں آرام اور راحت کے سینکڑوں ذرائع

ہیں لیکن حضرت امجد صاحب مال و دولت نہیں ہیں دنیائے فانی کی دولت سے آپ کا دامن خالی ہے۔ حرص و ہوا سے مستغنی ہیں بڑے بڑے صاحب مال و دولت آپ کے لئے دولت نثار کرنے کو تیار ہیں مگر آپ کسی دنیوی دولت کی طرف متوجہ نہیں بلکہ آپ کا دل تو درد محبت سے لبریز ہے۔ اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔

دنیا کے زر و مال سے گو ہاتھ ہی خالی　　المنۃ للہ کہ دل درد بھرا ہے
ہر چند جہاں میں ہیں بہت عیش کے ساماں　　لیکن کوئی یہ کہدے کہ میرے لئے کیا ہے

ظاہر میں تو سرسبز جگر غم سے ہے پُر خون
رنگ رخ امجد صفت برگ حنا ہے

غالب کی ایک اور غزل ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا　　درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

حضرت امجد کی ہی ایک غزل اسی "طرح" میں ہے۔ فرماتے ہیں۔

باغباں کی منت سے آپ کو رہا پایا　　جس نے غنچۂ دل کو باغ دلکشا پایا

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو شے اپنے پاس ہوتی ہے۔ پھر اسکی ضرورت نہیں ہوتی خواہش ہوتی ہے اور نہ طلب، وہی شے طلب کی جاتی ہے جو اپنے پاس نہیں ہوتی۔ خود غنچۂ دل باغ دلکشا ہے اس لئے باغباں کی منت کی ضرورت ہے اور نہ خوشامد کی۔ کیونکہ جب اپنے ہی پاس ایک دلکشا باغ ہے تو پھر کسی اور باغ میں جانے کی ضرورت نہیں

تصوف کا ایک اہم ترین مسئلہ خودی ہے۔ انسان ذات باری سے جدا ہے یا نہیں۔ میں اور تو کا ایک سخت ترین معمہ ہے۔ جس کا حل بڑے سے بڑے صوفی سے

بھی دشوار ہے۔ اس مسئلہ کا حل دیکھو۔

ترے وصل کی خواہش اک غلط نمائش ہے اپنے آپکو میں نے تجھسے کب جدا پایا

دُنیا میں دوست کی کیوں ضرورت ہے؟ اسکا جواب سنو:۔

ہم تو صاف کہہ دینگے مل گیا خدا اُس کو جس نے اس خدائی میں بندہ خدا پایا

معشوق کی پابوسی عاشق کا فریضہ زندگی ہے یہ ایک پامال مضمون ہے۔ ہر شاعر نے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ اسی طرح معشوق کے غصہ اور اس کے ناراضی کا خوف ہمیشہ دامنگیر رہا کرتا ہے۔ حضرت امجد معشوق کے غصہ کو بھی ایک نعمت تصور کرتے اور اسکو پائے بوسی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔

حیلہ ہاتھ آتا ہے خوب ہمکو پائے بوسی کا رکھہ دیا قدم پر سر جب انہیں خفا پایا

دُنیا میں امید اور ناامیدی دونوں توام ہیں امید نہ ہو تو اس خاکدان عالم میں ایک ساعت بھی بسر نہ ہو اس فلسفہ کو حضرت امجد سے سنو۔

ناامیدی و امید ساتھ ساتھ چلتی ہے بارہا اسے کھویا اور بارہا پایا

سانس کی ماہیت اور زندگی و موت کی تشریح دیکھو۔

سانس جسکو کہتے ہیں ایک پھانس ہے دلمیں زندگی کے دھوکے میں موت کا مزا پایا

ہر شے کے لئے کوشش اور جستجو ضروری ہے۔ نپولین کے پاس "ناممکن" کوئی لفظ ہی نہیں تھا عربی مثل ہے من جد وجد اس کی حقیقت اور پھر خدا کے وجود کو حضرت امجد کے الفاظ میں سنو

جستجو ہی اے امجد راز کامیابی ہے جس نے جابجا ڈھونڈا اس نے جابجا پایا

ذیل کی غزل بھی مدینہ منورہ میں لکھی گئی تھی۔ مولا کی گلی کی ماہیت اور اس کی تشریح جس طرح واضح کی گئی ہے وہ ممکن ہے بعض عقل والوں کے پاس دیوانہ کی دیوانگی ثابت ہو اور "ہنستے ہیں عقل والے" صحیح ہو جائے مگر بعض عقل والے[۵] دُور دُور سے اس دیوانہ کی ملاقات کو آتے اور مولا کی گلی کی حقیقت کو معلوم کرتے ہیں۔

کس چیز کی کمی ہے مولا تری گلی میں — دُنیا تری گلی میں عقبیٰ تری گلی میں
جام سفال اسکا تاج شہنشہی ہو — آجائے جو بھکاری داتا تری گلی میں
دیوانگی پہ میری ہنستے ہیں عقل والے — تیری گلی کا رستہ پوچھا تری گلی میں
اک آفتاب وحدت ہے جلوہ بخش کثرت — نکلی ہوئی ہیں گلیاں صدہا تری گلی میں
ہے فیض کی تجلی گھری اندھیریوں میں — بکتا ہے رات ہی کو سودا تری گلی میں
سورج تجلیوں کا ہر دم چمک رہا ہے — دیکھا نہیں کسی دن سایہ تری گلی میں
موت اور حیات میری دونوں ترے لئے ہیں — مرنا تری گلی میں جینا تری گلی میں

امجد کو آجتک ہم ادنیٰ سمجھ رہے تھے
لیکن مقام اسکا دیکھا تری گلی میں

عام طور پر غزل مسلسل نہیں ہوتی۔ اسکا ہر شعر دوسرے شعر سے تعلق نہیں رکھتا ہر ایک شعر جداگانہ مضمون کا حامل ہوتا ہے۔ حضرت امجد کی ذیل کی غزل مسلسل اور قطع بند ہے۔ یہ غزل کیسی ہے اسکا اندازہ خود ناظرین کر سکتے ہیں۔ میں صرف اسی قدر

---

[۵] یورپ کے ڈگری یافتہ اصحاب مراد ہیں۔

کہوں گا کہ تصوف کے اہم ترین مسئلہ کو اتنا صاف شاید کسی نے واضح کیا ہو گویا دریا کو کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اس غزل کا پانچواں شعر وجد کرنے کے قابل ہے۔

یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا — کوئی تم سا نظر نہیں آتا
ڈھونڈھتی ہیں جسے مری آنکھیں — وہ تماشا نظر نہیں آتا
جیتے جی اپنے اسکو دیکھونگا — مجھے ایسا نظر نہیں آتا
ہو چلی ختم انتظار میں عمر — کوئی آتا نظر نہیں آتا
جو نظر آتے ہیں "نہیں اپنے — جو ہے اپنا" نظر نہیں آتا
جھولیاں سب کی بھرتی جاتی ہیں — دینے والا نظر نہیں آتا
زیر سایہ ہوں اسکے اے امجد — جس کا سایہ نظر نہیں آتا

ہم یہ بیان کر چکے ہیں کہ حضرت امجد کی شاعری میں تصوف کا بڑا حصہ ہے تصوف کا اہم مسئلہ معرفت ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو جاننا اور سمجھنا۔ شاعرانہ پہلو سے جب اسپر نظر ڈالی جاتی ہے تو معرفت کے روح رواں خالق کائنات کی تصویر کھینچنی ضروری ہے اور اس کو تخیلی پیکر دیا جانا لازمی کیونکہ وہ شاعری جو تخیلی پیکر نہ ہو نظم نہیں ہو سکتی۔

ذیل کی غزل جس میں تصوف کے مختلف مسائل کا حامل ہے غور کے قابل ہے۔ اسمیں کیفیت عبدیت اور معرفت الہی اور توحید وجودی کے مسئلے کو بھی صاف کیا گیا ہے۔

ہم تو ایک بار اس کے ہو جائیں ‏ وہ ہمارا ہوا ہوا نہ ہوا
ڈھونڈتا ہوں میں ہر نفس اسکو ‏ ایک نفس مجھسے جو جدا نہ ہوا
کیا ملا وحدت وجودی سے ‏ بندہ بندہ رہا خدا نہ ہوا
بندگی میں یہ کبریائی ہے ‏ خیر گزری کہ میں خدا نہ ہوا
جا چکے عقل و ہوش تاب و تواں ‏ لیکن ابتک انا فنا نہ ہوا

موجودہ زمانہ کے صوفیا جس طرح بندگی میں کبریائی کرتے ہیں ان کی اصلاح کے لئے اس سے بہتر تعلیم نہیں ہوسکتی۔

اس کا ذکر ہو چکا ہے کہ حضرت امجد کا کمال فن یہ ہے کہ وہ مشکل سے مشکل تصوف اور فلسفہ کے اہم ترین مسئلہ کو اتنا صاف اتنا واضح اور اس قدر عام فہم الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ پھر ان کی شرح کرنے یا واضح اور صاف کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس قدر کلام پیش کیا گیا ہے اس سے ہمارے دعوے کی بخوبی تصدیق ہوسکتی ہے۔ ذیل کی غزل بھی ملاحظہ ہو جسکا ہر شعر ایک خاص کیفیت پیدا کرتا ہے۔

عالم میں ہر ایک اسکا شیدا نظر آتا ہے ‏ اس طور کا ہر ذرہ موسیٰ نظر آتا ہے
بندے کی معیت میں مولا نظر آتا ہے ‏ قطرے کی حقیقت میں دریا نظر آتا ہے
دریا کی تجسس میں پیاسا ہی نہیں حیراں ‏ دریا کبھی تو پیاسے کا پیاسا نظر آتا ہے
اللہ سمجھتا ہے کیا شان محمدؐ ہے ‏ بندہ کی نگاہوں میں بندہ نظر آتا ہے
کسطرح نظر آئے وہ پردہ نشیں امجد ‏ ہر پردے کے بعد اور ایک پردہ نظر آتا ہے

۱۰۸۹۵

خدا کی ذات کو معمولی آنکھ نہیں دیکھ سکتی مگر صوفی کامل اس کا جلوہ اپنی اس آنکھ سے بھی دیکھتا ہے مگر ہر وقت وہ بھی اسکے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی نہیں کر سکتا۔ گویا معشوق حقیقی پردہ میں ہوتا ہے اور چونکہ مسلمانوں میں عموماً پردہ کا رواج ہے اس لئے اس لفظ "پردہ" سے کلام میں خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے اور پردہ کی تشبیہ ایک خاص کیفیت پیدا کر دیتی ہے حضرت خواجہ میر درد فرماتے ہیں۔

آہ پردہ تو کوئی مانع دیدار نہیں
اپنی غفلت کے سوا کچھ در و دیوار نہیں

حضرت امجد نے بھی غزل بالا کے مقطع میں اسی پردہ کو ایک خاص رنگ میں پیش کیا ہے۔

کس طرح نظر آئے وہ پردہ نشیں امجد
ہر پردہ کے بعد اور ایک پردہ نظر آتا ہے

خدا کی ذات مثل اور مثال تمثیل سے بالاتر ہے مگر جب تک مثال دینے کے قابل نہ ہو اسکی تمثیل دی ہی نہیں جاتی۔ اور پھر خدا کی شان جلال اور جمال دونوں کی متصف ہے۔ جلالی شان جبروت کی مقتضی ہے جس سے ہر صوفی لرزاں رہتا ہے اور شان جمالی رحم و کرم کی پیکر ہے۔ اسکی شرح حضرت امجد یوں فرماتے ہیں۔

مثل و مثال سے بری حد مثال میں بھی آ   جاہ و جلال کے خدا شان جمال میں بھی آ

انسان کا ظاہر و باطن ایک ہونا اخلاق کی بڑی خوبی ہے۔ اسلام اسی کی تعلیم دیتا ہے۔ ظاہر میں کچھ اور باطن میں کچھ بدترین اخلاق ہے مگر افسوس آجکل مسلمانوں کا جو حال ہے اسکے بیان کی ضرورت نہیں۔

حضرت امجد فرماتے ہیں۔

قسمت بد کو نیک کر ظاہر و باطن ایک کر ۔۔۔ تو میرے قال میں بھی آ تو میرے حال میں بھی آ

خدا کی ذات ہر جگہ ہے کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں اسکا وجود نہ ہو۔ لیکن اس کے لئے کوئی خاص جگہ مخصوص نہیں کی جا سکتی اور ایسے کتنے ہیں جو اسکو مانتے اور سمجھتے ہیں۔

تو ہے جہاں میں ہر جگہ پھر بھی نہیں کسی جگہ ۔۔۔ نور زمین و آسمان چشم خیال میں بھی آ

مردہ دلی نکالدے جان میں جان ڈالدے ۔۔۔ چشمہ آب زندگی جام سفال میں بھی آ

انسان میں کبر و غرور بڑی بلا ہے یہ ایسا عیب ہے جو بدترین اخلاق قرار دیا جا سکتا ہے۔ خدا کو کبر و غرور پسند نہیں۔ متکبر کو وہ دوست نہیں رکھتا۔ صوفیا اولیا انکساری اور فروتنی کی تعلیم دیتے ہیں۔ حضرت امجد فرماتے ہیں۔

جامہ کبر چاک کر خود کو خودی سے پاک کر ۔۔۔ امجد منزلت طلب صف نعال میں بھی آ

خدا کے ہر جگہ ہونے مگر اس تک نہ پہونچنے کو دوسرے الفاظ میں اسطرح ادا کیا گیا ہے۔

وہ سب سے ہی نزدیک تر پھر بھی کوئی پاتا نہیں رکھتا ہے وہ سب پہ نظر لیکن نظر آتا نہیں

تقدیر اور تدبیر کو شیخ ناسخ نے خوب بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

ہم خواب میں واں پہونچے تدبیر اسے کہتے ہیں
وہ نیند سے چونک اُٹھے تقدیر اسے کہتے ہیں

اسی تقدیر اور تدبیر کو حضرت امجد نے اپنے طرز خاص میں بیان کیا ہے۔

وہ کرتے ہیں سب چھپکر تدبیر اسے کہتے ہیں ہم دھر لئے جاتے ہیں تقدیر اسے کہتے ہیں

کیا بہترین کلام ہے اور کس خوبی سے اصلیت کو واضح کیا گیا ہے دُنیا کا وہ کون کام ہے جو مشیت ایزدی کے خلاف ہوتا ہے اور پھر کام کی کامیابی اور ناکامی دار و گیر سب اسی کے ہاتھ میں ہے جو چھُپ کر سب کچھ کرتا ہے اور ہم اسکو اپنی اپنی تدبیر اور تقدیر سے موسوم کئے جاتے ہیں۔

اب بخوف طوالت ہم صرف ایک غزل کو پیش کر کے اس بیان کو ختم کئے دیتے ہیں۔ جو حضرت امجد نے مدینۃ طیبہ سے رخصت ہوتے وقت کہی ہے۔

شکستہ بال کے ہر بال و پر میں آگ لگی ارے کوئی تو بجھا دے جگر میں آگ لگی
ادھر جگر کی صدا ہے کہ پھُک گیا دل زار پکارتا ہے ادھر دل جگر میں آگ لگی
ٹپک رہے ہیں جب آنکھوں سے گرم گرم آنسو نہ کیوں یقین کروں چشم تر میں آگ لگی
بنا ہے گبر کا آتشکدہ دل مسلم جگر میں سینے میں پہلو میں بر میں آگ لگی

ہر ایک قطرہ خون بنگیا شرر، امجد
چراغ روح جلا تن کے گھر میں آگ لگی

رباعیات :- اب ہم حضرت امجد کی رباعیاں پیش کرتے ہیں اور یہ مبالغہ نہیں ہے کہ اقلیم رباعی کے آپ بادشاہ قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

رباعی کا عربی شاعری میں رواج تھا اور اس کو دوبیت کہا کرتے تھے۔ فارسی شاعری میں اگرچہ رباعی کا وجود بہت بعد میں ہوا مگر سلجوقی عہد میں اسی صنفِ شاعری کو خاصی ترقی ہوئی تھی کیونکہ تصوف کا زور بھی اسی زمانہ میں تھا۔ امام تصوف، امام غزالی اسی زمانہ میں تھے۔ عمر خیام بھی ان ہی کا ہمعصر تھا۔ چونکہ صنفِ شاعری میں رباعی ہی ایک ایسی نوع ہے جس کے ذریعہ حقائق اور معارف کا اظہار ہو سکتا ہے اس لئے ان لوگوں نے اپنے اظہار خیال کا آلہ اسی کو قرار دیا۔

فارسی میں شیخ ابوسعید ابوالخیر اقلیم رباعی کے پہلے سرتاج ہیں۔ شیخ ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے رباعی کے ذریعہ حقائق اور معارف کی اشاعت کی، شیخ کے بعد شیخ اوحدالدین مراغی عمر خیام اور سحابی نجفی کے نام پیش کئے جاتے ہیں، جن کی رباعیاں زبان فارسی کے انمول موتی ہیں۔ ایران کے قطع نظر ادھر ہندوستان میں سرمد نے سرزمین رباعی کو فلک الافلاک کا ہمسر بنا دیا۔ اور بقول گرامی مرحوم

آج حضرت امجد جواب سرمد ہیں ؎

امجد بہ رباعی ست فرد امجد کلک امجد کلیدِ گنجِ سرمد
گفتم کہ بود جواب سرمد امروز روح سرمد بگفت امجد امجد

مگر یہاں ہم کو فارسی رباعیوں سے بحث نہیں ہے بلکہ اردو رباعیوں کی بحث کرنی ہے۔ اس میں اب کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا دکن سے ہوئی اور ہم کو ابتدائی شاعری میں مثنوی کے ساتھ رباعی بھی نظر آتی

ہے مگر اسکو کوئی درجہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ دکن میں مثنوی کا رواج زیادہ تھا اور اسی مسلسل نظم میں شعرائے دکن نے اپنے کمال کا اظہار کیا ہے جس طرح اردو مرثیہ میں میر انیس اور مرزا دبیر نے اپنی معجز نمائی سے ایک جدید دبستاں کی بنیاد ڈالی اسی طرح رباعی بھی ان ہی دونوں کی منت پذیر ہے۔ انہی دو کے باعث رباعی میں جان پڑ گئی۔ میر انیس کے بعد ایسا کوئی شاعر نہیں ہوا جس نے اقلیم رباعی کی فرمانروائی کی ہو مگر آج حضرت امجد بیشک اس کے فرمانروا قرار دیئے جا سکتے ہیں

جس طرح آپ کی نظمیں چند اقسام میں بیان کی گئی ہیں اسی طرح آپ کی رباعیاں بھی حقائق و معارف تصوف۔ اخلاق اور فلسفہ وغیرہ اقسام پر تقسیم کی جا سکتی ہیں۔ رباعیات امجد کے نام سے آپ کی سینکڑوں رباعیاں شائع ہو چکی ہیں اور جمال امجد اور حج امجد وغیرہ میں بھی آپ کی بیسیوں رباعیاں ہیں۔ ان میں سے بعض کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

حقائق و معارف :۔ خدائے برتر کی توحید اس کی حقیقت اسکی معرفت اور وحدانیت کی تشریح میں حضرت امجد کی بیسیوں رباعیاں ہیں۔ جن کے ذریعہ آپ نے نہایت صاف اور آسان طریقہ پر اس اہم مسئلہ کی شرح فرمائی ہے بعض رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

خدائے قدوس کا ارشاد ہے تعز من تشاء جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور تذل من تشاء جس کو چاہتا ہے ذلیل و خوار کرتا ہے۔ ذیل کی رباعی اسی کی تفسیر ہے۔

ملاحظہ ہو :۔

ہر ذرّہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے　　اک چشم زدن میں کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام دبی زبان سے یہ کہتے ہیں　　وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

پتھر کو تو خدا بنا کر عزت دی گئی اور پھر انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے ادنیٰ ترین شئے پتھر کی پرستش میں مصروف کر کے ذلیل کیا۔

عام طور سے شعرا اپنے گناہوں کا اظہار کر کے خداوند کریم سے مغفرت کی اُمید کے مضمون کو بیان کرتے ہیں۔ حضرت امجد بھی لاتخزنا یوم القیامت کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں ؎

ضائع فرما نہ سرفروشی کو مری　　مٹی میں ملا نہ گرمجوشی کو مری
آیا ہوں کفن پہن کے اے رب غفور　　دھبہ نہ لگے سپید پوشی کو مری

اسی مضمون کی ایک اور رباعی ملاحظہ ہو۔

پائیں گے نئی حیات مرنے والے　　ہو جائیں گے مطمئن یہ ڈرنیوالے
اُمید ہے تو بھی بخش دیگا ہر جرم　　او ماں سے زیادہ پیار کرنیوالے

خدائے قدوس کی یافت کو ذیل کی رباعی میں ملاحظہ فرمائیں۔

ہر رات مرا ماہ جبیں آتا ہے　　گھر میں مرے وہ عرش نشیں آتا ہے
وہ راحت جان اگرچہ میری خاطر　　آتا ہے گرفت میں نہیں آتا ہے

خدائے برتر کی ہستی ایسے پردہ میں مستور ہے جو سوائے اہل باطن کے کسی کو نظر

نہیں آتی ۔ خانہ کعبہ کا غلاف بھی سیاہ ہوتا ہے ۔ اس خانہ خدا کے سیاہ پردے کو دیکھ کر حضرت امجد اسرار الٰہی کے متعلق ایک عجیب کیفیت بیان کرتے ہیں۔

ہے شاہدِ حُسن ہر جگہ پردے میں ملتی ہی نہیں کسی کو رہ پردے میں
اس کا ہر ایک راز کعبے کی طرح پردے میں ہی، اور وہ بھی سیہ پردے میں

ہم جب کسی سے ملنا چاہتے ہیں تو پہلے گھر کا پتہ دریافت کرتے ہیں اور جب مکان معلوم ہوجاتا ہے تو پھر کبھی نہ کبھی صاحب خانہ سے ملاقات ہوجاتی ہے خانہ کعبہ کی زیارت کے بعد حضرت امجد نے کس طرح نقش تسکین قائم کیا ہے۔ وہ قابلِ صد تحسین ہے ؎

رستہ ترا سر سے طے کیا ہے ہم نے سب کچھ تری رہ میں دیدیا ہے ہمنے
مل لیں گے کبھی تجھ سے بھی انشاءاللہ گھر تو ترا دیکھ ہی لیا ہے ہم نے

اس رباعی میں لفظ "انشاءاللہ" نے جو خوبی پیدا کردی ہے وہ اہلِ ذوق سے مخفی نہیں ہے۔

خدا کی مخلوق لاتعداد ہے مگر ایسے کتنے ہیں جن کو اس خالقِ لم یزل کا رستہ معلوم ہوتا ہے؟ آجکل ریل، جہاز، موٹر اور ایروپلین کے باعث فاصلہ کم سے کم ہوتا جاتا ہے۔ دُنیا اس کوشش میں ہے کہ زیادہ سے زیادہ فاصلہ کم سے کم وقت میں طے ہوجائے اس مادی ترقی کے باوجود اہلِ یورپ جس طرح خدا سے بیگانہ ہیں اور مادہ پرستی میں مبتلا ہیں وہ بھی ظاہر ہے اس کے بعد ذیل کی رباعی ملاحظہ ہو۔

اُس مہر جہاں تاب کا ذرّہ نہ ملا　　لاکھوں میں کسی ایک کو رستہ نہ ملا
زپلین میں اڑا ریل میں دوڑا لیکن　　بندے کو کہیں پتہ خدا کا نہ ملا

انسان خلیفہ اللہ فی الارض ہے خدا نے ایک امانت اس کے سپرد کی ہے مگر ایسے کتنے انسان ہیں جو بارِ امانت کو اُٹھا سکتے ہیں ؟ یعنی لاتحملنا مالا طاقۃ لنا بہ کی تفسیر دیکھو ؎

ہر گام پہ چکرا کے گرا جاتا ہوں　　نقشِ کفِ پا بن کے مٹا جاتا ہوں
تو ہی تو سنبھال مرے دینے والے　　میں بارِ امانت میں دبا جاتا ہوں

نقشِ کفِ پا اور بارِ امانت نے اس رباعی میں کتنی بلندی پیدا کر دی ہے ، وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں ہے۔

خاتم النبییٖن کے ثبوت میں اور شاعروں نے بھی طبع آزمائی کی ہے مگر حضرت امجد کی رباعی ملاحظہ ہو گویا مصنف نے رباعی کی مشق اسی رباعی کے لئے کی ہے ؎

رُخ مہر ہے قد خط شعاعی کی طرح　　ہے گلّۂ امت میں وہ راعی کی طرح
اس خاتم انبیا کا آخر میں ظہور　　ہے مصرعہ آخر رباعی کی طرح

معراج رسالت کے متعلق بھی اکثر شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے بلکہ دکنی شاعروں نے معراج نامہ کے نام سے مثنویاں لکھی ہیں اور اپنی دیگر مثنویوں میں بھی معراج کا عنوان قائم کر کے اظہار خیال کیا ہے مگر سینکڑوں اشعار

کی مثنویوں سے بہتر ایک رباعی ملاحظہ ہو ؎

حیرت نہیں بے سایہ اگر ذات ہوئی — ٹکڑے کیا چاند کیا کرامات ہوئی
دنرات تھا جلوۂ خدا پیشِ نظر — معراج ہوئی تو کیا نئی بات ہوئی

معشوق کی ناراضی عاشق کے لئے ایک مصیبت عظمیٰ ہوتی ہے، اور اس خوف سے ایسا قصور نہیں کیا جاتا جو اسکی ناراضی کا سبب ہو۔ مگر حضرت امجد قصور بھی کرتے ہیں تو اس کو ایک نعمت تصور کرتے ہیں جس سے معشوق کی پا بوسی حاصل ہوتی ہے ؎

حیلہ ملتا ہے رنگ لانے کے لئے — ہو کچھ تو سبب اُنکو منانے کے لئے
موقع ملتا ہے پاؤں پر گرنے کا — کرتا ہوں قصور بخشوانے کے لئے

مدینہ میں دربار رسالت میں حاضر ہو کر جو حالت بے خودی طاری ہوئی اسکا اظہار ذیل کی رباعی میں فرمایا ہے۔ ؎

گم ہیں خرد و حواس عنقا کی طرح — دل ہو گیا صاف انکی کفِ پا کی طرح
گر نورِ خدا نہیں ہے جلوہ ان کا — پھر کیوں مجھے غش آ گیا موسیٰ کی طرح

عبادتِ الٰہی:— فی زمانہ جس طرح عبادت الٰہی کی جانب سے غفلت کی جاتی ہے وہ ظاہر ہے۔ نماز، روزہ اور زکوٰۃ اسقدر اہم تصور نہیں کیا جاتا جتنا کہ سینما اور تھیٹر سے دلچسپی ہوتی ہے حضرت امجد صوفی ہیں مگر ان صوفیا کی طرح نہیں جو نماز روزہ سے خود کو مستثنیٰ تصور کرتے ہیں۔ اس عنوان میں ہم ان

رباعیوں کو پیش کرتے ہیں جس میں عبادت کی ترغیب دی گئی ہے ۔

زنجیرِ درِ عرش ہلاتا ہوں میں　　آنکھ اس سے نماز میں لڑاتا ہوں میں
سجدہ کے بہانہ دل کی بیتابی سے　　قدموں پہ کسی کے لوٹ جاتا ہوں میں

اس سر پہ زمیں شاخ کا پھل اعلیٰ ہے　　عامل معمولی ہے عمل اعلیٰ ہے
پوچھو نہیں سجدہ کرنیوالوں کے دماغ　　سر خاک میں لب پہ ربی الاعلیٰ ہے

خالق نے جنہیں دیا ہے زر دیتے ہیں　　زر کیا ہے خدا کی راہ میں گھر دیتے ہیں
اپنا سرمایہ ہے رکوع و سجدہ　　سامان نہیں رکھتے ہیں سر دیتے ہیں

پایا نہ حیات کا ثمر اک دن بھی　　ہم کو نہ ہوا خدا کا ڈر اک دن بھی
کیا حق ہے زمیں پہ پاؤں رکھنے کا ہمیں　　رکھا نہیں جب سجدہ میں سر اک دن بھی

فطرت ہر چیز کی طرف مڑتی ہے　　ٹوٹی ہوئی چیز آکے پھر جڑتی ہے
ہوتا ہے نماز میں ہجومِ خطرات　　گھر جاتے وقت خاک بھی اڑتی ہے

دلبر کے لئے ادائے ناز اچھی ہے　　عاشق کے لئے رسمِ نیاز اچھی ہے
موقع ہے یہی تو اک قدم لینے کا　　ہر اک عبادت سے نماز اچھی ہے

اکثر صوفیا کا اس پر اعتقاد ہے کہ دعا انسان کی بھلائی کے لئے ضروری ہے اور وہ اُس کو زندگی کا لازمہ تصوّر کرتے ہیں۔ حضرت امجد بھی اس سے متفق ہیں۔ دعا کی فضیلت اور اس کی تمثیل میں جو حکمت نوازی فرمائی ہے وہ ملاحظہ ہو۔

ہر دم اُس کی عنایت تازہ ہے   اُس کی رحمت بغیر اندازہ ہے
جتنا ممکن ہو کھٹکھٹائے جاؤ   یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے

بندہ ہے مگر خدا کا دم بھرتا ہے   پروانہ ہے شمع سے نہیں ڈرتا ہے
جب ہاتھ اُٹھاتا ہے دعا میں مسلم   اپنے رب سے مصافحہ کرتا ہے

بعض اہلِ دُنیا ہر وقت یہ گلہ شکوہ کرتے ہیں کہ ہائے ہماری دعا قبول نہیں ہوتی حالانکہ خود خدا کا ارشاد ہے "ادعونی استجب لکم" مگر پھر بھی ہماری دعا قبول نہیں ہوتی حضرت امجد سے اس کا جواب سنو کہ کیوں دعا قبول نہیں ہوتی۔

لے لے کے خدا کا نام چلاتے ہیں   پھر بھی اثرِ دعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ پڑھتے ہیں نماز   کرتے نہیں پرہیز دوا کھاتے ہیں

اخلاقی رباعیاں :۔ اس عنوان میں ہم اُن رباعیوں کو پیش کرتے ہیں جو درستی اخلاق اور فلسفہ اخلاق کے متعلق ہیں۔ اس قسم کی رباعیوں کا بڑا ذخیرہ ہے مگر یہاں ان میں سے بعض کو پیش کیا جاتا ہے۔

انسان کے لئے طاعت نہایت ضروری ہے مگر اس میں خود نمائی نہ ہو اِس

نکتہ کو جس طرح تمثیل سے واضح کیا گیا ہے ملاحظہ ہو ؎

بے فائدہ کب ہے جبہ سائی اچھی — طاعت میں نہیں ہے خودنمائی اچھی
اِک سجدہ میں خاک کر دیا ہستی کو — حضرت اِتم سے ہے دیا سلائی اچھی

خودنمائی کی مذمت میں ایک اور رباعی ملاحظہ ہو ؎

مرمٹتے ہیں ذلیل خواہش کیلئے — بالیدہ ہوتی ہے روح کاہش کیلئے
ہر حال میں ہے مفاخرت مدِنظر — پتلے مٹی کے ہیں نمائش کے لئے

کم ظرفی کی مذمت اور اُسکی تمثیل دیکھو ؎

کم ظرف اگر دولت و زر پاتا ہے — مانند حباب اُبھر کے اتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس — تنکا تھوڑی ہوا سے اُڑ جاتا ہے

قناعت کی تعلیم "ہرچہ گیرید مختصر گیرید" کی تشریح دیکھو ؎

گرمی میں غم لبادہ نازیبا ہے — مستی میں خیال بادہ نازیبا ہے
کافی ہے ضرورت کے موافق دُنیا — جامہ قد سے زیادہ نازیبا ہے

انفعال کی تفسیر ملاحظہ ہو ؎

پیاسوں پہ کرے گا مہربانی پانی — آتش پہ کرے گا حکمرانی پانی
کیا نارِ سقر جلا سکے گی واعظ — خود شرم سے ہو رہا ہوں پانی پانی

متاع الدنیا قلیل کی تفسیر دیکھو ؎

زیبائش و تزئین پہ نظر ہوتی ہے — آخر کی کبھی کچھ تجھے خبر ہوتی ہے
یہ موئے سیہ سپید ہوں گے اک دن — امجدؔ! ہر شام کی سحر ہوتی ہے

ندامت کے متعلق ایک اور رباعی سنو ؎

اس باغ سے مثلِ بُو اُڑا جاتا ہوں — جان اپنی مصیبت سے چھڑا جاتا ہوں
احباب مرے دفن کی کیوں فکر میں ہیں — میں شرمِ گنہ سے خود گڑا جاتا ہوں

مصاحبت کی مذمت دیکھو ؎

عزت نہ ملی کبھی مصاحب ہو کر — بے قدر ہوا ہے قلب قالب ہو کر
موجود میں سو عیب نظر آتے ہیں — ہر چیز پسند آتی ہے غائب ہو کر

انسان کے خبثِ باطنی کے متعلق فرماتے ہیں ؎

اِک، ایک کی تاک میں لگا رہتا ہے — خون ایک کا اک کے ہاتھ سے بہتا ہے
انسان کے خبثِ باطنی کے آگے — شیطان بھی لاحول ولا کہتا ہے

نیک کاموں کی ہدایت ؎

اس نام کی زندگی میں کچھ جان تو ہو — گر بن نہ سکے فرشتہ انسان تو ہو
نیکی نہ ہوئی نہ ہو بدی بھی تو نہ کر — صوفی نہ ہوا نہ ہو مسلمان تو ہو

سوال کرنے کی مذمت اور صرف خدا ہی سے طلب کرنے کی ہدایت یوں کرتے ہیں ؎

ہر چیز مسبب سبب سے مانگو ــــ منت سے خوشامد سے ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو ــــ بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

اسی مضمون کی ایک اور رباعی ؎

اپنے آقا سے کج ادائی ؟ توبہ ــــ نااہلوں کے در پہ جبہ سائی ؟ توبہ
غیروں سے تعلقات ؟ رب کے ہو کر ــــ شوہر رکھ کر بھی آشنائی ؟ توبہ

انسان اس فکر میں رہتا ہے کہ دُنیا اُس کی قدر کرے اہلِ دُنیا اُس کی عزّت کریں حضرت امجد اُس کی یوں مذمت کرتے ہیں ؎

کیا فکر ہے کوئی قدرداں ہو کہ نہ ہو ــــ جھوٹی دُنیا میں عز و شاں ہو کہ نہ ہو
اللہ مسرتِ حقیقی دے دے ــــ ہم زندہ رہیں نام و نشاں ہو کہ نہ ہو

دُنیا میں سینکڑوں اصحاب ایسے ہیں جو مرشد بنکر لوگوں کی دولت کے حقدار بن جاتے اور دوسروں کی محنت اور کمائی پر بلا کسی حق کے اپنا دستِ تصرف دراز کرتے ہیں، ایسے جھوٹے صوفیوں کی مذمت سنو ؎

دُنیا کو کیا خراب اچھا بن کر ــــ لی جان ہزاروں کی مسیحا بن کر
شیخ نجدی ! خدا ہی سمجھے تجھ کو ــــ ڈھایا کعبے کو تو نے قبلہ بن کر

عموماً دنیا داروں کو یہ گلہ رہتا ہے کہ ہماری قدر نہیں ہوتی اور خصوصاً شعراء کو اس امر کا رونا ہوتا ہے کہ افسوس ہم کو کوئی نہیں پوچھتا۔ حضرت امجدؔ اس پر رنج و غم نہیں کرتے افسوس نہیں کرتے بلکہ اہلِ دنیا کو بتاتے ہیں کہ اس پر رونا صحیح نہیں ہے۔ دُنیا اس لئے نہیں ہے کہ اپنی قدر دانی نہ ہونے پر صفِ ماتم قائم کی جائے۔

دُنیا نہیں جائے کامرانی کے لئے ‏ ‏ مجلس یہ نہیں مرثیہ خوانی کیلئے
جب ماقدروا اللہ خدا کہتا ہے ‏ ‏ کیا روتے ہو اپنی قدردانی کیلئے

انسان کا ظاہر و باطن یکساں نہیں ہوتا ایک شخص مقدس صورت میں نظر آتا ہے۔ ہاتھ میں ہزار دانہ کی تسبیح ہوتی ہے اور پیشانی پر سیاہ داغ ہو جاتا ہے۔ منبر پر وعظ و نصیحت سے پرہیزگاری کی ہدایت کرتا ہے مگر خود عامل نہیں ہوتا۔ سود کھاتا۔ زنا کرتا۔ غیبت۔ چغلی سے نہیں بچتا۔ ایفائے وعدہ نہیں کرتا۔ اس کے برعکس ایک بظاہر گنہگار ہوتا ہے تسبیح و مصلے سے کام رکھتا ہے اور نہ تقدس ظاہر کرتا ہے مگر خدا سے ڈرتا۔ ایفائے عہد کرتا غیبت نہیں کرتا چغلی سے پرہیز کرتا ہے وہ کسی کو ایسی نصیحت نہیں کرتا جس پر خود عامل نہیں ہو جاتا۔ حضرت امجدؔ اس ظاہر و باطن کے اختلاف کے متعلق فرماتے ہیں۔

تقریر تو سُن چکے اثر بھی دیکھو ‏ ‏ باتیں تو بہت ہوئیں ہنر بھی دیکھو
ہوتا نہیں ظاہر پہ قیاس باطن ‏ ‏ دلق اطلس کا استر بھی دیکھو

فلسفہ :- رباعی ہی ایک ایسی نوع شاعری ہے جس میں فلسفی نکتے بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ اُردو شاعری میں ایسے بہت کم شاعر ہیں جنہوں نے فلسفہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ غالب کے کلام کو تمام تر فلسفہ کہا جاتا ہے۔ شاطر مدراسی کا کلام بھی فلسفیانہ ہوتا ہے۔ حضرت امجد کی ایسی رباعیاں جس میں فلسفی راز پنہاں ہیں بیسیوں ہیں ہم بعض کو یہاں متعارف کراتے ہیں۔

گردش میں یہ گردباد آخر کب تک　　طرح کون و فساد آخر کب تک
ٹوٹے گا طلسم مادیت اک دن　　اضداد میں اتحاد؟ آخر کب تک

انسان کا جسم ایک چھوٹی دُنیا ہے جس میں سینکڑوں کل پُرزے کام کرتے ہیں۔ انسان کی زندگی ایک گھڑی ہے جو چلتی رہتی ہے۔ انسان کی سانس ہی ایک ایسی رفتار ہے جس پر زندگی کا دارو مدار ہے ؎

سانچے میں اجل کی ہر گھڑی ڈھلتی ہے　　ہر وقت یہ شمع زندگی جلتی ہے
آتی جاتی ہے سانس اندر باہر　　یا عمر کے حلق پر چھُری چلتی ہے

اسی مضمون کی امجد رباعی ؎

اچھا نہیں یہ غرور جلدی کیجے　　حتی الامکان ضرور جلدی کیجے
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے آتے جاتے　　چلنے کے لئے حضور جلدی کیجے

انسان کے لئے کوشش ضروری ہے۔ انسان کی حالت بدلتی رہتی ہے۔

کسی حالت میں قرار نہیں ہو سکتا ؎

فطرت کا تقاضا ہے کہ کوشش میں رہے
دلچسپی عقل ہے کہ کاوش میں رہے
جب تودہ خاک پھر رہا ہے دن رات
خاکی انسان کیوں نہ گردش میں رہے

دُنیا کی کوئی شے حقیر نہیں ہے یہاں کا ذرّہ ذرّہ کارآمد ہے۔ ایک حقیر شئے جو کوئی حیثیت نہیں رکھتی بڑے سے بڑا نقصان کر دیتی ہے۔ زہر کا ایک قطرہ انسان کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ بارود کا ایک ذرّہ بڑے سے بڑے پہاڑ کو اڑا دینے کی قوت رکھتا ہے۔ بجلی کی ایک حرکت کیا سے کیا کر دیتی ہے۔

اسی فلسفہ کو حضرت امجد نے کس عمدگی سے ذہن نشین کرایا ہے ؎

گیسو لہرا کے ناگ ہو جاتا ہے
نوحہ آخر میں راگ ہو جاتا ہے
ہر چند دیا سلائی ایک تنکا ہے
صرف ایک رگڑ سے آگ ہو جاتا ہے

اسی طرح دُنیا میں بعض اشیا بظاہر بیکار اور بے فائدہ معلوم ہوتے ہیں مگر جب انکو اپنے محل اور موقع پر نظر غور سے دیکھا جائے تو ان کی خوبی اور حقیقت واضح ہوتی ہے۔ اسی فلسفہ کو ملاحظہ فرمائیں۔

ساغر کے صفات جام جم میں دیکھو
آہن کا ہُنر تیغ دودم میں دیکھو
تقلید ہے جامع کمال اطلاق
کیا حُسن ہے سنگ میں صنم میں دیکھو

دُنیا میں نیک نامی اور بدنامی توام ہیں جو جس قدر نیکنامی میں مشہور ہوتا ہے

بدنامی میں بھی فوراً مشہور ہو جاتا ہے۔ جہاں خیر ہوتا ہے وہاں شر بھی ہوتا ہے جہاں علم ہوتا ہے وہاں جہل بھی پایا جاتا ہے جب تک شر اور جہل کا وجود نہ ہو اسوقت تک خیر و علم کا امتیاز ہو ہی نہیں سکتا۔ اس فلسفہ کو ذیل کی رباعی میں ملاحظہ فرمایا جائے۔

ہے نام کے ساتھ ساتھ بدنامی بھی ہے کام کے ہمرکاب ناکامی بھی
عرفاں کا دعویٰ ہی جہالت کی دلیل اظہار میں پختگی کے ہے خامی بھی

مفلس یہ خیال کرتا ہے کہ دولت بڑی شئے ہے اور اہل دولت بڑی راحت اور آرام میں ہوں گے۔ مگر اہل دولت سے پوچھو کیا واقعی ان کو آرام و راحت میسر ہے تو جواب نفی میں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ دولت آرام و راحت کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ وبال جان ہے۔ اس کو آرام سے سونا میسر نہیں ہوتا۔ ہر وقت یہ کھٹکا رہتا ہے کہ کہیں اس کی دولت ہاتھ سے نکل نہ جائے حضرت امجد کا قول ہے کہ دولت سے راحت دوا سے صحت غذا سے قوت حاصل نہیں ہو سکتی۔ دولت اور افلاس کا مقابلہ ملاحظہ ہو:۔

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے بیفکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آسان کردی دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے

انسان کی زندگی عارضی ہے اسکی ہر سانس یہ خبر دیتی ہے کہ زندگی کی منزل ختم اور راستہ طے ہوا جاتا ہے ہماری اس عارضی زندگی کا اختتام معلوم نہیں

ایک بھلا چنگا تنومند انسان جو آج ہے وہ کل ختم ہو جاتا ہے۔ موت کے لئے بیماری کی ضرورت ہے، نہ درد دُکھ کی۔ اسکے لئے کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ حضرت امجد کیا بہترین طریقے سے اس کی تفسیر فرماتے ہیں۔

کبتک ہے یہ زندگی قضا کو معلوم
کبتک ہے بقائے تن فنا کو معلوم
جاتی تو ہوں واپسی خدا کو معلوم
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے جاتے جاتے

انسان ہر شئے کی ماہیت کے دریافت میں لگا رہتا ہے۔ "یہ کیوں، وہ کیوں؟" کالامتناہی سلسلہ چلا جاتا ہے جس کا کہیں خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ آخر حضرت انسان کی عمر تمام ہو جاتی ہے ؎

یہ نافۂ مشک ہے کہ خون ہی کیا ہے؟
اعجاز ہے سحر ہے فسوں ہے کیا ہے؟
مُنہ موت نے بند کر دیا آخر کار
ہم کہتے ہی رہ گئے یہ کیوں ہے کیا ہے؟

اسی مضمون کی ایک اور رباعی ؎

تقدیر سے کیا گلہ خدا کی مرضی
جو کچھ بھی ہوا، ہوا خدا کی مرضی
امجد ہر بات میں کہانتک کیوں کیوں
ہر کیوں کی ہے انتہا خدا کی مرضی

تقدیر و تدبیر کا حل دیکھو ؎

پابند خیال میری تقریر رہی
آزادی یہ بھی پاؤں میں زنجیر رہی
تھا جتنا خدا کا حکم کوشش کرلی
تدبیر بھی وابستۂ تقدیر رہی

سکرۃ الموت کی وجہ سنو ؎

سرمایۂ زندگی ہے کھونے کیلئے　　سب جاگ رہے ہیں صرف سونے کیلئے
بے وجہ نہیں ہے سکرۃ الموت آمجد　　پیتے ہیں شراب مست ہونیکے لئے

دُنیا میں حرکت ہر شے کا لازمہ ہے سائنس کی دُنیا کا دارومدار حرکت پر ہی ہے

میدانِ عمل میں گامزن ہے حرکت　　خورشیدِ سکون کی اِک کرن ہے حرکت
ہوتی نہیں ابتدا بساکن آمجد　　ہے جاں مثال حرف تن ہے حرکت

اِس دُنیا کی کوئی شے بیکار نہیں ہے ہر شے کے اندر اُس کے فوائد پنہاں ہوتے ہیں ہر شے کی خاصیت معلوم ہونا دشوار ہے ، دُنیائے کیمیا کے علمار اشیار کی ماہیت اور اسکی ترکیب معلوم کرنے میں مصروف ہیں مگر کیا اِس خاکدان عالم کے ہر شے کی ماہیت اور خواص معلوم ہو چکے ہیں ؟ نہیں لاکھوں اشیار ایسی ہیں جن کی ماہیت سے انسان اور علمار کیمیا محض ناواقف ہیں ۔ انسان کو جیسے جیسے معلومات ہوتے جاتے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کا کوئی ذرہ کوئی مخلوق بیکار نہیں ہے ۔ انسان کی عقل کی رسائی سے ہنوز لاتعداد اشیار باہر ہیں ؎

اِس جسم کی کیچلی میں اِک ناگ بھی ہے　　آواز شکستہ دل میں اِک راگ بھی ہے
بیکار نہیں بنا ہے اِک تنکا بھی　　خاموش دیا سلائی میں اِک آگ بھی ہے

روح اور جسم کے تعلق کو دیکھو ؎

بچپن ہی کے پہلو میں جوانی بھی تو ہے
باقی ہی کے آغوش میں فانی بھی تو ہے
سمجھے ہو غلط روح جدا جسم جدا
جو برف کی شکل ہے وہ پانی بھی تو ہے

علماء سائنس کا اس پر اتفاق ہے کہ دنیا کی ہر شے میں بجلی ہے۔ البتہ ہم ان تماموں سے کام نہیں لیتے، مگر اس کام نہ لینے سے انکا وجود نابود نہیں ہو جاتا۔

اس ابر کی تہ میں برق خنداں ہی ہے
یہ گوشۂ تنگ محشرستان ہی ہے
بجلی سی بھری ہوئی ہے اسکے اندر
یہ تن کا پہاڑ آتش افشاں ہی ہے

انسان اشرف المخلوقات ہے ہر شے کو وہ اپنے لئے تصوّر کرتا ہے اور ان پر حکومت کرتا ہے مگر دیکھو خود اس کی حقیقت اُسکو کہاں تک معلوم ہے ؟ ؎

عالم میں ہمارا کون محکوم نہیں
دُنیا میں ہماری کس جگہ دھوم نہیں
کیا پوچھنا ہے ہمارا اللہ اللہ
ہم وہ ہیں کہ خود ہمیں کو معلوم نہیں

تصوّف۔ حضرت امجد کی رباعیوں کا بڑا حِصّہ تصوف پر مشتمل ہے۔ رباعیات امجد کے علاوہ خرقۂ امجد۔ جمال امجد۔ اور حج امجد میں بھی بیسیوں رباعیاں ہیں۔ ہر ایک رباعی قابلِ اظہار ہے مگر ہم چند رباعیوں پر اکتفا کرتے ہیں

وحدت الوجود کو مختلف رباعیوں میں ثابت کیا گیا ہے چند رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

ذرّہ ذرّہ میں ہے خدائی دیکھو
ہر بُت میں ہے شانِ کبریائی دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم
ہر اک میں ہے مگر اکائی دیکھو

انسان ہزاروں ہیں مگر قسم ہے اِک
الفاظ بکثرت ہیں مگر اسم ہے ایک
اس عالمِ کثرت کا ہے منشا واحد
اعضا ہیں جدا جدا مگر جسم ہے ایک

کثرت میں نظر آتی ہے وحدت دیکھو
اکبار یہ قعدہ واقامت دیکھو
توحید فی الافعال ہے گر مدنظر
مسجد میں صلوٰۃ باالجماعت دیکھو

تصوّف میں "ہمہ اوست" بھی ایک اہم مسئلہ ہے اس کی تفسیر ملاحظہ ہو ؎

واجب سے ظہور شکلِ امکانی ہے
وحدت میں دوئی کا وہم نادانی ہے
دہوکا ہے نظر کا ورنہ ہر شئے ہمہ اوست
گرداب حباب موج سب پانی ہے

ہمہ اوست کے مقر صوفیا دُنیا کی ہر شئے میں خدا کا جلوہ دیکھتے ہیں ہر قطرہ میں معرفت کا سمندر موجیں مارتا نظر آتا ہے۔ درخت کے پتّہ پتّہ میں اس کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ جہان کے ذرّہ ذرّہ میں اس کا عکس نمایاں ہوتا ہے اسی اصول کے تحت یہ رباعی ہے ؎

ہر قطرہ میں بحرِ معرفت مضمر ہے
ہر اک ذرّہ میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے

ہو چشمِ بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی   گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

اسی مضمون کی ایک اور رباعی ملاحظہ ہو

صنعت تری ہر خار دکھا دیتا ہے   ہر غنچۂ گل تیری صدا دیتا ہے
ہر اصل اصول معرفت ہے یارب   پتّہ پتّہ ترا پتہ دیتا ہے

فلسفۂ غم کے تحت ذیل کی رباعی قابل ملاحظہ ہے۔

غم میں رُخِ مقصود نظر آتا ہے   جلتی ہوئی شاخ میں ثمر آتا ہے
ہے زخم جگر میں تیری ہنستی صورت   ہر چوٹ کے ساتھ تو اُبھر آتا ہے

تصوف میں "میں اور تو" کا مسئلہ "ہمہ اوست" کی گویا تفسیر ہے اس کے متعلق مختلف رباعیاں ہیں جن میں بڑی خوبی سے اس مسئلہ کا حل کیا گیا اور نہایت صاف طریقہ سے اسکو واضح کیا گیا ہے، بعض رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

میرے ہی مکان سے وہ ناگہ نکلا   سمجھا تھا جسے دور وہ ہمراہ نکلا
میں محو رہا نفی میں جسکی دن رات   آخر میں وہی اِلٰہ اللہ نکلا!

ہیں مست مئے شہود تو بھی میں بھی   ہیں مدعی نمود تو بھی میں بھی
یا تو ہی نہیں جہاں میں یا میں ہی نہیں   ممکن نہیں دو وُجود تو بھی میں بھی

بے خود میں رہوں تو وہ قریں آتا ہے
اس پردہ میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے میں نہیں رہتا ہوں
میں جب رہتا ہوں وہ نہیں آتا ہے

حاصل نہ کیا مہر سے ذرّہ تم نے
دریا سے پیا نہ ایک قطرہ تم نے
امجد صاحب خدا کو کیا سمجھو گے
اپنک خود ہی کو جب نہ سمجھا تم نے

دم بھر درِم آدم کو سمجھتے ہوتے
دن رات کے ہمدم کو سمجھتے ہوتے
یہ سچ ہے کہ ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں
اے کاش کہ ہم ہم کو سمجھتے ہوتے

میں قلزمِ ذخّار ہوں منبع تو ہے
میں مہر جہاں تاب ہوں مطلع تو ہے
ہے فرق بہت لطیف ہم دونوں میں
مانند ضمیر میں ہوں مرجع تو ہے

حضرت امجد اپنے تصوف کے رنگ میں قرآن شریف کے جلوں کی ایسی بہترین تفسیر فرماتے ہیں جس سے بہتر شاید ہی ممکن ہو۔ بعض رباعیاں ملاحظہ ہوں۔ اذکرونی اذکرکم۔ ۵

غم سے ترے اپنا دل نہ کیوں شاد کروں
جب تو سنتا ہے کیوں نہ فریاد کروں
میں یاد کروں تو، تُو مجھے یاد کرے
تو یاد کرے تو میں نہ کیوں یاد کروں

وحملها الانسان کانہ ظلوماً جھولا۔

اس سینے میں کائنات رکھ لی ہیں نے	کیا ذکر صفات ذات رکھ لی ہیں نے
ظالم سہی جاہل سہی نادان سہی	سب کچھ سہی تیری بات رکھ لی ہیں نے

دُنیا میں گو ہمیشہ حق کی فتح ہوتی ہے مگر ابتدا میں باطل ہی کا اظہار ہوتا ہے۔ جبتک باطل نہ ہو حق کا وجود ناممکن ہے۔ باطل کے حق کا اظہار سُنو ؎

عاجل کا بھی آخر کوئی حق ہے کہ نہیں	زائل کا بھی آخر کوئی حق ہے کہ نہیں
کچھ دن تو بتوں کی بھی خدائی دیکھو	باطل کا بھی آخر کوئی حق ہے کہ نہیں

انسانی نفس اور روح کی حقیقت تصوف کا ایک اہم مسئلہ ہے، آیا روح اور نفس جدا ہیں یا دونوں ایک اس کے متعلق حضرت امجدؔ دونوں کو ایک تصور کرتے ہیں۔ جب ادراک مادّی مقتضیات کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو اس کو نفس کہتے ہیں اور جب مادّیت اور جسمانیت سے قطع نظر کے اپنی اصلیت اور بساطت کا رُخ کرتا ہے تو اُس کو روح کہتے ہیں یعنی حالیہ ترکیب اور موجودہ وضع کا نام جسم اور مادّیت ہے اور اصلیت کا نام روحانیت ؎

کس طرح میں آپ کو ٹٹولوں یارب	کس کانٹے میں اس جنس کو تولوں یارب
مخفی ہے تعین ہی میں اطلاق کا راز	کیوں کر گرہ وجود کھولوں یارب!

تصوف میں جبتک تمام دُنیا سے ہاتھ نہ دھولیں مقصد اعلیٰ حاصل نہیں ہوسکتا اور ایک کے ہوجانا ضروری ہے اُسکی تفسیر سُنو ؎

ساری دُنیا سے ہاتھ دھو کر دیکھو　　جو کچھ بھی رہا سہا ہے کھو کر دیکھو
سب کچھ نہ ملے اگر تو میرا ذمہ　　اک مرتبہ تم ایک کے ہو کر دیکھو

انسانی روح بلندی کی طرف متوجہ رہتی ہے مگر یہ جسم انسانی اس وقت تک مانع ہوتا ہے جب تک کا اس کا تعلق اس سے باقی رہتا ہے جب جسم انسانی سے رُوح جُدا ہو جاتی ہے تو پھر وہ اپنے مقام اعلیٰ کی طرف پرواز کر جاتی ہے۔

بیداد پہ صیاد کمر بستہ ہے　　کس طرح نکل سکوں کہ دربستہ ہے
کہدے کوئی میرے ہمصفیروں سے ذرا　　اک طائر اوج سدرہ پربستہ ہے

قرآن مجید کلامِ الہی ہے کسی کو اس میں انکار کی گنجائش نہیں۔ اس کے ساتھ ایک اور حقیقت بھی ہے جو صرف دیدۂ بصیرت سے دیکھی جاسکتی ہے یعنی

قرآنِ کریم میں کرامت دیکھی　　ہر جزو کے ساتھ کل کی شرکت دیکھی
ہر منزل کو اُسی کی منزل پایا　　ہر سورت میں خدا کی صورت دیکھی

انسان کی حقیقت کیا ہے ؟ اس کا جواب سُنو ؎

یہ سنگ نشاں ہے منزلِ وحدت کا　　پیدا نہ ہوا کوئی پھر اس صورت کا
انسان جسے کہتے ہیں دُنیا والے　　قدِ آدم ہے آئینہ قدرت کا

تو خاص رموزِ حق کا گنجینہ ہے　　اسرار سے لبریز ترا سینہ ہے

مرآۃ جمال پاک ہے روح لطیف　　　یہ جسم ترا روح کا آئینہ ہے

حضرت امجد صاحب باطن روشن ضمیر صوفی صافی ہیں اپنی حالت کے متعلق اظہار سنئے۔ جو عین حقیقت ہے ؎

سوتا ہوں تو چپکے سے جگا دیتا ہے　　　جب جاگ اُٹھتا ہوں پھر سلا دیتا ہے
ہنستے کو رُلا دیتا ہے چٹکی لے کر　　　روتا ہوں تو پھر ہنس کے ہنسا دیتا ہے

جو شخص کسی بادشاہ کا مقرب خاص ہوتا ہے تو اس کو دوسرے لوگوں کی بہ نسبت زیادہ خوف ہوتا ہے خاصانِ خدا کی بھی یہی حالت ہے۔ ان کو ہر وقت خوفِ الٰہی دامن گیر رہا کرتا ہے ؎

اُسکی میری موافقت مشکل ہے　　　عبد اور رب میں مناسبت مشکل ہے
ہے جس کا کمال کُلِّ یومٍ فی شان　　　ایسے مالک کی عبدیت مشکل ہے

قطعات

حضرت امجد کے مختلف اقسام کلام مثنوی غزل رباعی وغیرہ کی صراحت کردی گئی ہے۔ اب قطعات پیش کئے جاتے ہیں اگرچہ ان کی تعداد مختصر ہے۔ مگر اہمیت کے لحاظ سے یہ بھی کم درجہ نہیں ہیں۔ رباعیوں کی طرح ان میں بھی حقائق اور معارف کا اظہار ہوا ہے۔ یہاں چند قطعات پیش کئے جاتے ہیں۔

تصوّف میں نفس کشی پہلا زینہ ہے۔ جب تک یہ طے نہ ہو سلوک کے مراتب حاصل نہیں ہو سکتے۔ اولیاء اللہ نے اپنے نفس کو جس طرح توڑا تھا اور دُنیا کی عزّت کو ٹھکرا دیا تھا، اس کے بیسیوں واقعات ہیں۔ دُنیا دار دُنیا میں عزّت کا خواہاں ہوتا ہے۔ مگر صوفی آخرت کی عزت کا طلبگار رہتا ہے۔ اِن کو دُنیا کی عزت یا مرتبہ کی خواہش نہیں ہوتی۔ وہ دُنیا میں ذلیل و خوار رہنا پسند کرتے ہیں۔ خاکساری اور تواضع ان کے اعلیٰ صفات ہوتے ہیں۔ حضرت امؔجد ایک قطعہ میں اپنی خاکساری کی یوں شرح فرماتے ہیں۔

جہاں کو ناز ہے ہستی پر اپنی　　میں اپنی نیستی پر مر رہا ہوں
ملا ہے جب سے لطفِ خاکساری　　تنزل میں ترقی کر رہا ہوں

اس دُنیا میں انسانی زندگی ایک حباب سے بڑھ کر نہیں ہے۔ زندگی جاوید صرف مرنے کے بعد حاصل ہو سکتی ہے مگر اس کے باوجود ہم زندگی پر مرے جاتے ہیں اور موت سے ڈرتے ہیں۔ یہ روز نظر آتا ہے کہ جو آج ہے وہ کل نہیں رہتا جو کل ہے وہ پرسوں نہیں رہتا۔ اسکے باوجود ہماری جو حالت ہے وہ ظاہر ہے۔ حضرت امؔجد اس زندگی کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

میں اس دریائے موجزن میں　　مانند حباب اُبھر رہا ہوں
ہر سانس میں پھانس کی کھٹک ہے　　پھر بھی جینے پہ مر رہا ہوں

دُنیا کی حالت کا نقشہ ایک اور قطعہ میں یوں پیش کیا ہے۔

ہوتی تھی کبھی ہماری خاطرداری | بنتا تھا یقیں اپنا ہر اک خطرہ
یا وہ عزت تھی یا ہے اب یہ ذلت | قطرے سے گُہر بنے گُہر سے قطرہ

ایک اور قطعہ :—

ہاتھ آکے ہر ایک چیز نکل جاتی ہے | تم لاکھ پُکارا کرو لینا لینا
کل تک سب کچھ تھا آج کچھ بھی تو نہیں | دُنیا میں چلا جاتا ہے دینا لینا

دُنیا میں حرص و ہوا روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ آلائشِ دُنیا سے کوئی پاک نہیں۔ انساں کی حرص کا صحیح فوٹو ذیل کے قطعہ میں کھینچا گیا ہے۔

ہٹتی ہی نہیں کسی طرح پھر آنکھیں | دیکھا جو کہیں کھانے کا برتن کوئی
بڑھتی جاتی ہے حرص جتنا کھاؤ | بچپن میں ملا ہوا ہے چورن کوئی

بعض مرتبہ نقل سے اصل حاصل ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہم کسی شخص کی نقل کرتے ہیں اور چند روز کے بعد وہی نقل ہم میں موجود ہو جاتا ہے کہا جاتا ہے کہ عشق حقیقی کے لئے پہلے عشق مجازی کی ضرورت ہوتی ہے۔

خون دل مشق روانی کرکے پانی ہو گیا | خاطر جمع اپنی اُلجھن سے پریشاں ہو گئی
نقش باطل سے ہوا آخر حقیقت کا ظہور | نقل کرتے کرتے اصلیت نمایاں ہو گئی

جب تک خودی کو ترک نہ کر دیا جائے خدا نہیں مل سکتا۔ اور جب کوئی

انسان اپنی جان سے اُٹھ جاتا ہے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔

جب تک ہے خودی خدا نہیں مِل سکتا — خود کو گم کر دو کچھ اگر پانا ہے
اُٹھے ہوئے فتنے دم میں دب جاتے ہیں — اک مرتبہ بس جان سے اُٹھ جانا ہے

حشر کے ہول سے دُنیا والے لرزاں ہیں۔ مگر خاصانِ خدا حشر کی خواہش کرتے ہیں۔ اور اس کو نعمتِ عظمیٰ خیال کرتے ہیں۔

کیا خوف ہے آتشِ سقر سے اُنکو — جو دل کی لگی کو دل لگی کہتے ہیں
جس کو سمجھتے ہیں حشر دُنیا والے — ہم تو اُسے شرحِ زندگی کہتے ہیں

خدا ہر اُس شخص کا ہے جو دل سے اُسے پکارتا ہے۔

امجد اس جا کسی کی تخصیص نہیں — جو مجھکو پکارتا ہے اسکا ہوں میں
سنتا ہوں صدائے دردِ ہر بیکس کی — ملنے والے سے دل سے ملتا ہوں میں

انسان کے لئے غم بڑی مصیبت ہے۔ ہزار طرح کی نعمتیں غم کے آگے ہیچ ہیں۔ انسان کا دل جب غمگین ہو جاتا ہے۔ تو پھر کوئی ایسی شے نہیں۔ جو اُس کو غم سے راحت دے سکے۔ غرض غم بُری بلا ہے۔ خاصانِ خدا کے لئے دُنیاوی زندگی بھی ایک غم ہے جس کے باعث وہ اس دُنیا میں خوش نہیں رہ سکتے۔

غم کے ہاتھوں ہے روز بربادی — عمر بھر بے شمار موتیں ہیں
موت میں ایک بار مرنا ہے — زندگی میں ہزار موتیں ہیں

تبصرہ:۔ کسی قدر تفصیل کے ساتھ حضرت امجد کے ہر قسم کے کلام کو پیش کر دیا گیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ دریا سے ایک قطرے کا بھی اظہار نہیں ہوا۔ لیکن جو کچھ کلام پیش کیا گیا ہے۔ اس سے آپ کے کلام کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہماری اُردو شاعری کا سِن و سال ساڑھے پانچسو سال کا ہے۔ اس طویل مدت میں دکن اور شمال سے ہزاروں شاعر پیدا ہوئے سینکڑوں ایسے ہیں جن کے کلام سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ مگر بڑا حصہ ایسا ہے۔ جن کا کلام آج مرورِ زمانہ کے نذر ہو چکا ہے۔ نہیں معلوم ان میں کیسے کیسے گراں قدر جوہر نہاں تھے۔

جن شاعروں کے کلام سے ہم بخوبی واقف ہیں۔ ان میں سے بیسیوں ایسے ہیں جنکا کلام زمانہ سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے مگر ایسے خوش نصیب بہت کم ہیں جنکا کلام متعدد مرتبہ شائع ہوا اور شمال اور دکن میں مقبول ہوا ہو۔ اِن خوش نصیب شعرا میں سے جنکا کلام بارہا شائع ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ میرؔ، دردؔ اور غالبؔ سب سے زیادہ پیش پیش ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ میر تقی میرؔ کے کلام کا سوز و گداز، خواجہ دردؔ کے کلام کا سراپا تصوف اور غالبؔ کی فلسفہ آمیزی اِن کے کلام کے اس سے زیادہ قدر دانی کے مستحق ہیں۔ باغِ اُردو کی چمن بندی میں ان کے کلام سے سدا بہار پھول کھلے ہوئے ہیں۔ جن کی رنگینی اور خوشنمائی جاذبِ نظر اور خوشبو سے گلستان ہند کی فضا معطر ہے۔

حضرت امجدؔ کے کلام میں میرؔ کا سا درد اور سوز و گداز خواجہ میر دردؔ کا سا تصوف اور غالبؔ جیسا فلسفہ موجود ہے۔ آپ کے کلام سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ آپ کا کلام جہاں سراپا سوز و گداز درد و الم سے بھرا ہوا ہے وہاں اخلاق

اور فلسفہ کے گرانقدر نکتوں اور تصوف کے بیش بہا نگینوں سے جڑا ہوا ہے۔

آپ کے کلام میں اگر کہیں تصوف کے انمول ہوتی ہیں تو کہیں اخلاق کے عمدہ اور بہترین خیالات کے نفیس جوہر محفوظ ہیں۔ کسی میں فلسفی نکات بیان کئے گئے ہیں تو کسی میں ادبی ریزے پنہاں ہیں۔ کسی میں قرآن مجید کا اقتباس آنکھوں کو بینا کرتا ہے تو کہیں حدیث شریف کے انوار کو رباطن کو نور بصر بخشتے ہیں۔ کسی میں انسانی جذبات موجزن ہیں تو کہیں معرفت الٰہی کا سمندر رواں ہے۔

پھر آپ کے کلام کی صفائی سادگی عام فہمی قابل داد ہے۔ مشکل سے مشکل تصوف اور فلسفہ کے اہم مسائل کو جس طرح صاف اور واضح الفاظ میں آپ ادا کرتے ہیں وہ درحقیقت اعجاز ہے۔

بہترین نظم اور عمدہ شاعری کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ وہی کلام بہترین ہوسکتا ہے جو صفائی نازک خیالی اور تاثیر میں بڑھا ہوا ہو۔ حضرت امجد کے کلام میں یہ تینوں امور جس خوبی اور بہترین طریقہ سے جمع ہو گئے ہیں وہ قابل داد ہے اور پھر آپ کی شاعری حقیقی جذبات اور خیالات کا آئینہ ہے۔ آورد نہیں بلکہ آمد ہے۔

آپ کی شاعری خصوصاً رباعیوں کے متعلق اہل ذوق اصحاب نے جن بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ درحقیقت بالکل واجبی ہے۔ مثلاً ڈاکٹر سر اقبال تحریر فرماتے ہیں کہ ہر رباعی قابل داد ہے۔ انکے پڑھنے سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ علامہ عبداللہ عمادی لکھتے ہیں کہ معراج سخن میں شاہد معنی کو ہر ہفت دیکھنا ہو تو رباعیات امجد کو دیکھئے۔ علامہ حیدر یار جنگ (علی حیدر طباطبائی) لکھتے ہیں کہ رباعیات امجد کی داد دینا سخن شناسی کا مقتضا ہے۔ مولانا مناظر احسن پروفیسر عثمانیہ کالج ارقام فرماتے ہیں کہ حضرت امجد ہندوستان کے ان شعرا میں سے ہیں جنکو زمانہ صدیوں کے بعد پیدا کرتا ہے۔

شمس العلما مولوی محب الحق لکھتے ہیں کہ ہر رباعی ضرب المثل ہونیکے قابل ہے۔ مولانا عبدالماجد صاحب دریاآبادی لکھتے ہیں کہ رباعیات آمجد معنویت کی بلندی اور طرز ادا دونو حیثیت سے قابل داد ہیں۔ مرحوم عظمت اللہ خاں لکھتے ہیں۔ رباعیات آمجد زندگی کی اعلیٰ ترین رُخ کی تفسیر ہیں۔ اور بلحاظ ادب اظہار خیال کا بہترین نمونہ ہے۔ پروفیسر الیاس برنی تحریر کرتے ہیں کہ ایسے ہی کلام سے یقین ہوتا ہے کہ شاعری جزویست از پیغمبری۔ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم لکھتے ہیں۔ آمجد صاحب قدرتی شاعر ہیں مبصرین کی رائے میں اسوقت ہندوستان میں ان کی ٹکر کا رباعی کہنے والا کوئی شاعر نہیں ہے

ان اعلیٰ خیالات کے بعد میرا تبصرہ کرنا یا حضرت آمجد کے کلام پر کوئی رائے دینا کیا حقیقت رکھتا ہے ہ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ میں نے اپنی نااہلی اور عدم استطاعت کے باعث حضرت آمجد کے کلام کی جیسی چاہیئے تفسیر نہیں کی۔ اور اپنے نقطۂ نظر سے کلام آمجد کا انتخاب پیش کیا۔ اگر کوئی قابل شخص قلم اٹھائے تو حضرت آمجد کے کلام کے اصلی جوہر اس سے زیادہ تاباں اور درخشاں نظر آئیں گے۔ فقط

نصیر الدین ہاشمی

جام باغ

ترپ بازار

حیدرآباد دکن

یورپ میں دکھنی مخطوطات

کے

متعلق بعض مشاہیر یورپ اور ہندستان کے آرا کا خلاصہ

ہماری تالیف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" کے متعلق نہ صرف ہندوستان بلکہ انگلستان وغیرہ سے بھی بے شمار آرا کا اظہار ہوا ہے ان میں سے بعض کا مختصر خلاصہ پیش کیا جاتا ہے:۔

(۱) **پروفیسر سی۔ اے اسٹوری**۔ درحقیقت یہ نہایت عمدہ اور مفید کام ہے اور اردو مطالعہ کے لئے دائمی اور قیمتی اضافہ ہے۔

(۲) **پروفیسر ڈاکٹر آر۔ پی ڈیوہسٹ**۔ اس اہم تالیف سے آپ کی انتہائی محنت کاوش اور قابلیت ظاہر ہوتی ہے جو آپ کے یورپ کے کتب خانوں میں محتاط ریسرچ کا نتیجہ ہے۔ یہ تالیف قدرداران اردو کے لئے قیمتی خزانہ ہے۔

(۳) **پروفیسر کرنکو**۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا یہ ریسرچ ہندوستان کے باہر انگلستان میں بھی اردو ادب کی ترقی میں معاون ہوگا۔ کیونکہ عموماً خیال یہ ہے کہ اردو میں کوئی ادب نہیں ہے جس کے لئے محنت و مشقت کی جائے۔

(۴) **پروفیسر ڈاکٹر ٹی۔ جے بیلی**۔ آپ کی بہترین تالیف کا میں نے دلچسپی اور شوق سے مطالعہ کیا اور ایک تفصیلی ریویو بعض رسالوں کے لئے لکھا ہے۔

(۵) سر محمد اقبال۔ یہ کتاب اُردو زبان اور لٹریچر کے تاریخ میں نہایت مفید ثابت ہوگی۔ آپ کا یہ کارنامہ قابلِ قدر ہے۔

(۶) چودہری سر ظفر اللہ خاں سابق ممبر تعلیم گورنمنٹ آف انڈیا۔ آپ کی محنت وکاوش اور دلچسپی آپ کی علم دوستی کی ایک زبردست شہادت ہے۔ آپ نے ادب اُردو پر احسان عظیم اس قیمتی تالیف سے کیا ہے۔

آپ کی مساعی جلیلہ نے تصنیف وتالیف کے میدان میں ادب اُردو کے دورِ اُفتادہ اور فراموش شدہ تاریخ کو خادمان اُردو کے ہاتھوں میں دے کر ایک قابلِ قدر ایزادی کی ہے۔ جو ادب اُردو کی ابتدائی اور دکھنی شکل وصورت کو عاشقان ادب کے مشتاق نگاہوں کے سامنے رکھہ کر ملک کے علمی دولت میں مائیہ فخر اضافہ کا سامان بہم پہونچائے گی۔

(۷) جسٹس سر عبد القادر۔ آپ نے نہایت محنت اور کاوش سے ادب اُردو کی ایک بڑی خدمت کی ہے۔

(۸) جسٹس سر محمد سلیمان۔ آپ نے اس کو مرتب اور شائع کرنے میں محنت شاقہ برداشت کی ہے مجھے یقین ہے کہ آپ کی تالیف نے اُردو ادب میں قیمتی اور بہترین اضافہ کیا ہے۔

(۹) سر تیج بہادر سپرو۔ اس قسم کی کتاب بغیر سخت محنت وتحقیقات کے طیار نہیں ہوسکتی۔ جس قدر میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے اس سے تو مجھے نہایت دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔

(۱۰) مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب حسب نواب صدر یار جنگ بہادر۔ بے شبہ یہ تصنیف

تاریخ ادب کے لئے گراں مایہ سرمایہ ہے۔ آپ نے وہ مواد مورخین ادب کے سامنے رکھہ دیا ہے جو عام تو کیا خاص کی رسائی سے بھی باہر تھا۔ اس کی مدد سے جو مقدمے لکھے جائیں گے ظاہر ہے کہ آبحیات کا مقدمہ اُن کے سامنے سراب ہی ثابت ہوگا۔ اور اس کے لئے آپ کی کاوش ومحنت اہلِ ادب کے لئے منت افزا ہوگی۔

(۱۱) ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبہ مشرقی الہ آباد یونیورسٹی۔ آپ نے واقعی بڑی عرق ریزی کی ہوگی۔ تب کہیں سال بھر میں یہ مواد یکجا کر پائے ہوں گے یہ صرف آپ کا شوق مفرط تھا جس نے اس ناکافی مدت میں آپ سے یہ کام کروالیا۔ کتاب کی ترتیب بھی بہت خوب ہے۔

اے کاش آپ کو زیادہ موقع ملتا اور آپ اُردو کے پورے ذخیرہ کی تلاش وترتیب اسی نہج پر کرسکتے آپ کی یہ کتاب آیندہ کام کرنے والوں کو بہت مدد دے گی اور جس قدر تحقیقی کام کی طرف لوگوں کی توجہ زیادہ ہوگی لوگ آپ کے زیادہ شکر گزار ہونگے۔

مولانا عبداللہ عمادی۔ حضرت جوش ملیح آبادی۔ مولانا احسن مارہروی۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی۔ پروفیسر محفوظ الحق۔ ڈاکٹر زبیر احمد وغیرہم کے آرا بخوف طوالت درج نہیں کئے گئے۔

بعض رسائل و اخبارات کے تنقید کا خلاصہ

(۱) معارف اعظم گڈھ۔ یورپ کے مشہور کتب خانوں سے دکھنی مخطوطات کا عطر کشید کیا اور اب وہی کشید اس مجموعہ میں پیش کیا ہے۔

افسوس ہے کہ مولف کو وہاں قیام کا مزید موقع نہ مل سکا کہ وہ جرمنی وغیرہ کے کتب خانوں سے بھی استفادہ کرتے اور یہ مجموعہ صحیح معنوں میں یورپ میں دکھنی مخطوطات سے موسوم ہوتا۔

جناب ہاشمی نے اپنی ان تحقیقات وانکشافات سے اُردو تاریخ کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

(۲) ہمایوں لاہور۔ ہاشمی صاحب نے یہ کتاب لکھہ کر تاریخ ادب اُردو کی بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ شایقین ادب کو مولف کی اس جانکاہ محنت کی داد دینی چاہیئے۔ پانچ روپیہ میں تاریخ ادب کے یہ جواہر گویا کوڑیوں کے مول ہیں۔

(۳) ساقی دہلی۔ اہل ذوق اصحاب میں ہاشمی صاحب بھی ہیں جو اپنے معاصرین میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ صاحب موصوف کو دکھنی اُردو کے قدیم مصنفین اور اساتذہ کی تصانیف اور کلام جمع کرنے سے خاص شغف ہے۔ ہاشمی صاحب کی جانفشانی کا اندازہ اس امر سے ہوسکتا ہے کہ صاحب موصوف نے قلیل عرصہ میں یورپ کے بارہ کتب خانوں سے استفادہ کیا۔

اپنی زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے دکھنی مخطوطات کا مطالعہ ازحد دلچسپ اور مفید ثابت ہوگا۔ لائق مولف کی سعی مشکور ہے اور دکن اگر اپنے اس ہونہار سپوت پر فخر کرے تو بجا ہے۔ سلطان العلوم کے ادب پرور حکومت میں ہاشمی صاحب زیادہ سے زیادہ حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔

(۴) جامعہ دہلی۔ جن کتابوں اور مصنفین کی نسبت اس کتاب میں معلومات لکھی گئی ہیں وہ اُردو زبان کے قدیم ترین کارنامے اور اساتذہ ہیں۔ جن سے بالعموم

لوگ واقف نہیں۔ اس لئے اُردو زبان کی تاریخ میں یہ کتاب نہایت اہم ہے اور ہاشمی صاحب کی یہ کوشش ان کی دوسری کتابوں کی طرح اُردو زبان کی تنقیدی و تحقیقی کارناموں میں ایک بے نظیر کارنامہ ہے۔ کیونکہ جب تک اس سے مدد نہ لی جائے گی کوئی تاریخ اُردو زبان کی مکمل نہ ہو سکے گی۔

(۵) ادبی دُنیا لاہور۔ یہ کتاب اُردو زبان کی تاریخ کے سلسلے میں ہاشمی صاحب کی بے حد قابلِ قدر اور شاندار کوشش ہے۔ سال بھر میں اس قدر مسالہ فراہم کرکے ترتیب دینا ہاشمی صاحب ہی کا دل گردہ تھا۔ انہیں افسوس ہے اور بجا افسوس ہے کہ اس سلسلے میں انہیں جرمنی کے کتب خانوں کی دیکھ بھال کا موقع نہ ملا۔ اور کتاب میں یہ افسوسناک کمی رہ گئی۔ لیکن جو کچھ ان سے ہو سکا وہ بھی کوئی معمولی کام نہیں ہے۔ اُردو زبان جب تک زندہ ہے ہاشمی صاحب کی یہ کوشش اہلِ مذاق سے خراجِ تحسین وصول کرتی رہے گی۔

(۶) نگار لکھنؤ۔ ہر چند اس میں زیادہ تر صرف دکن ہی کے شعراء و مصنفین کے مخطوطات پائے جاتے ہیں۔ لیکن تاریخ دکن کی اہمیت اور اس حقیقت کے لحاظ سے کہ زبان اُردو کا تعلق دکن سے قدیم تر تعلق ہے۔ یہ اس درجہ مفید و اہم ہے کہ اُردو لٹریچر کا کوئی محقق و متنفس اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

(۷) سچ لکھنؤ۔ جن حضرات کو اس موضوع اور اس فن سے دلچسپی ہے ان کی ضیافتِ ذوق کے لئے خاصا سامان اپنی مشقت اور دیدہ ریزی سے بہم پہونچا دیا ہے۔

(۸) ہندوستانی الہ آباد۔ مولف نے دکھنی نظم و نثر کے مختلف دَور کے جو نمونے پیش کئے ہیں ان سے نہ صرف مخطوطات کی حالت منکشف ہوتی بلکہ اس سلسلے

میں دکن میں اردو کی تدریجی ترقی پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

(۹) رسالہ مکتبہ حیدرآباد۔ ہاشمی صاحب نے جو اس سے قبل دکن میں اردو لکھ کر کافی شہرت حاصل کرچکے ہیں اب ایک ضخیم اور کارآمد کتاب شائع کی ہے۔ کتاب کی وسعت اور مخطوطات کی کثرت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے بہت دیدہ ریزی اور محنت سے ان کو دیکھا اور ان کا باہمی موازنہ کیا ہے مصنف کی یہ کوشش قابل ستائش ہے۔ اگر اسی طرح اردو کے قدیم ادبی خزانوں پر تحقیق ہوتی رہے تو تاریخ ادب کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

(۱۰) اخبار رہبر دکن۔ مولف نے اپنی اس ضخیم تصنیف کے ذریعہ جو ان کے سال بھر کی یورپ میں علمی تحقیقات کا نتیجہ ہے بڑا احسان کیا ہے۔ یورپ کے متعدد کتب خانوں میں قدیم دکھنی تصانیف کے قلمی نسخوں کا بالعان نظر مطالعہ کرکے مواد جمع کیا اور اسکو اس ضخیم کتاب کی صورت میں سلیقے سے درست کرکے پیش کیا۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تاریخ اردو کا ذوق رکھنے والوں کو یہ تالیف بڑی حد تک نایاب قدیم دکھنی تصانیف کے قلمی نسخوں کے مطالعہ سے جو یورپ کے کتب خانوں میں بکھرے ہوئے ہیں بے نیاز کردیتی ہے اور قابل قدر و لایق مطالعہ ہے۔

(۱۱) صحیفہ۔ مولف نے یورپ کے کتب خانوں سے بہت سا مواد اپنی مختصر سی سیاحت کے دوران میں سمیٹا اور بہت سے مصنفین و مولفین اردو کا نام اپنی اس تالیف کے ذریعہ منظر عام پر پہونچادیا۔ اردو کے جواہر کے متجسس مولف نے بڑی عرقریزی کے ساتھ مواد جمع کیا ہے۔

(۱۲) صبح دکن۔ قابل مولف کی یہ محنت بہت ہی قابلِ قدر اور لائق ستایش

ہے۔ اردو ادب میں دکھنی تصنیفات اور مخطوطات کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اس لحاظ سے زیر تبصرہ کتاب ایک اچھے رہبر و رہنما کا کام دے سکتی ہے۔

اقتباس تنقید رسالہ اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز (لندن) از پروفیسر ڈاکٹر بیلے

جامعہ عثمانیہ اور اس کے متعلقہ اداروں کے قیام کی بنا پر وہاں گزشتہ چند سال سے بڑی جد وجہد پائی جاتی ہے۔ نوجوان جو تمام کے تمام دکھنی ہیں اور معمر حضرات جو اکثر شمالی ہند سے آتے ہیں دونوں ادبی پیداوار میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ متقدم الذکر حضرات میں عبدالقادر سروری، محی الدین قادری، سید محمد اور پیش نظر کتاب کے مصنف کے نام لینا کافی ہے۔ ان حضرات نے جو کام کیا ہے اس کا بڑا حصہ پسندیدہ ہے۔

ہاشمی صاحب کو دکن میں اردو کے مولف کی حیثیت سے ہم پہلے سے ہی جانتے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے مختصر طور پر اپنے وطن کے اردو ادب کی تاریخ بیان کی ہے۔

اب انہوں نے اپنے موضوع کو ایک اور نہایت ہی دلچسپ انداز میں وسعت دی ہے۔ مولف نے یہاں کی فہرستوں کے مواد کے کچھ حصے کے ترجمے کے علاوہ انہوں نے مخطوطات اور ان کے مصنفین کا مزید احوال بیان کیا ہے۔ ان کا یہ کام ان کی پہلی محنت کا ضمیمہ ہے۔

یہاں کے ایسے طلبار کے لئے یہ کام بہت مفید ہو سکتا ہے جن کو یہ معلوم کرنے کی خواہش ہو کہ ان دکھنی مخطوطات کا کیا احوال ہے جو برطانیہ عظمیٰ میں موجود ہیں۔ قطب شاہی اور عادل شاہی سلاطین کے ادبی کارناموں سے اہل یورپ روشناس نہیں ہیں۔ یہ امر قابل افسوس ضرور ہے بالخصوص محمد قلی قطب شاہ کے بارہ میں یہ امر اور زیادہ افسوسناک ہے۔ محمد قلی قطب شاہ بہت عالی مشرب اور شعر کہنے کا اسکو قابل لحاظ ملکہ حاصل تھا۔

آخر میں ہاشمی صاحب ہمارے دلی شکریہ کے مستحق ہیں جنہوں نے ایک بڑے کام کو کامیاب انجام پر پہنچا دیا کتاب مفید اور ساتھ ہی ساتھ دلچسپ ہے۔

اقتباس تنقید رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن از ڈاکٹر بیلے

ہاشمی صاحب نے سات کتب خانوں کا دورہ کیا چھ تو اس ملک کے اور ایک پیرس کا۔ ان کتب خانوں کی فہرست میں جن مخطوطات کا ذکر ہے ان کا معاینہ کیا اور پیش نظر کتاب میں مولف نے ایک ایک مخطوطہ کے متعلق متعلقہ فہرست میں جو کچھ لکھا پایا ہے اس کا ترجمہ کیا ہے اور پھر کتاب اور اس کے مصنف کے متعلق مزید معلومات بہم پہنچائے ہیں۔ مولف نے ہر شخص پر اور خصوصاً یوروپین علمار پر جو اردو ادب کے ابتدائی دور کے مطالع کی خواہش رکھتے ہیں احسان کیا ہے۔

اردو کی بعض دلچسپ ترین کتابیں اس عہد کی ہیں جو دکن میں سنہ ۱۷۰۰ء سے پہلے لکھی گئی ہیں۔ ابتدائی دکھنی مصنفین کے ادبی کارناموں کی مذمت شمالی ہند

کے لوگوں کی عادت رہی اور شاید ہمیشہ رہے گی۔ اس کے تین سبب ہیں اول یہ کہ شمالی ہند کے ناظرین دکھنی لٹریچر سے نابلد ہیں دوسرے یہ کہ وہ اس پر رشک کرتے ہیں کہ دکن کو اس خصوص میں دو یا تین سو سال یا اس سے زیادہ کی تقدیم حاصل ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ ظاہری اسلوب کو غیر ضروری اہمیت دیتے ہیں اور اس طرح ایسی کتابوں کی اندرونی خوبیوں کی گہرائیوں تک پہونچنے میں ناکام رہتے ہیں جو دَورِ حاضرہ کی زبان اور صنائع کے معیار پر پورے نہیں اُترتے۔

اس وقت دکن خاصی ادبی زندگی کا مرکز بن گیا ہے۔ اور متعدد جوشیلے کام کرنے والے پائے جاتے ہیں ہاشمی صاحب نے ان کی شہرت کو نہایت قابلیت کے ساتھ برقرار رکھا ہے اور ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔"

فہرست مضامین "مقالات ہاشمی"

ادبی

تمت بالخیر

مؤلف کی دیگر کتابیں

(۱) "یورپ میں دکھنی مخطوطات" - اسکے متعلق جو بلند پایہ خیالات مشاہیر یورپ اور ہندوستان نے ظاہر کئے ہیں انکی وضاحت اس کتاب کے آخر صفحات سے بخوبی ہو سکتا ہے - مزید صراحت کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی - قیمت غیر مجلد (للعہ/) مجلد (صہ/)

(۲) "دکن میں اردو" - ہاشمی صاحب کی پہلی تالیف جس کے صلہ میں سرکار عالی نے مؤلف کو یورپ کا وظیفہ عطا فرمایا -

دکن میں اردو کی ابتدا اور اسکی ترقی کے متعلق بہترین تاریخ ہے - نظم و نثر کے نمونے بھی دئے گئے ہیں - بار ثانی کے صرف چند نسخے باقی ہیں - قیمت ؏

(۳) "رہبر سفر یورپ" - اس سے یورپ کے سفر کے متعلق نہایت عمدہ معلومات حاصل ہوتے ہیں - سفر یورپ کے لئے درحقیقت رہبر کا کام دیتی ہے - سفر یورپ کے متعلق جتنے ضروری امور ہیں ان سب کا اسمیں تفصیل سے ذکر ہے - اور پھر یورپ کے تمدن و معاشرت پر بھی بخوبی روشنی پڑتی ہے - قیمت .. - .. ۱۲/

(۴) "مقالات ہاشمی" - مولف کے ادبی تنقید - تاریخ اور معاشرتی وغیرہ مضامین جن کی فہرست اس کتاب کے آخری صفحات میں شامل ہے - .. .. - .. زیر ترتیب -

ملنے کے پتے

ظہیر الدین - قادر مسکن جام باغ ترپ بازار حیدرآباد دکن

مکتبہ ابراہیمیہ - محی الدین بلڈنگ مصطفیٰ بازار حیدرآباد دکن